پنجاب میں اُردو ادب کا اِرتقاء

سنہ ۱۸۴۹ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک

(تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی)

سنہ ۱۹۷۸ء

از:
ممتاز اختر مرزا (ممتاز گوہر)

نگران:
ڈاکٹر ناظر حسن زیدی

بحوالہ مراسلہ نمبر 69 - 1467 پنجاب یونیورسٹی، لاہور

16/9/82

فہرست مندرجات

پیش لفظ			ا	تا	ھ
پہلا باب	تاریخی اور ادبی پس منظر	صفحہ	۱	تا	۳۷
دوسرا باب	۱۸۴۹ء سے ۱۸۶۴ء تک	"	۳۸	تا	۹۱
تیسرا باب	۱۸۶۴ء سے ۱۸۸۱ء تک	"	۹۲	تا	۱۵۵
چوتھا باب	۱۸۸۲ء سے ۱۹۱۴ء تک	"	۱۵۶	تا	۲۱۳
پانچواں باب	تلخیصات و توضیحات	"	۲۱۴	تا	۲۳۹
مآخذ		"	۲۴۰	تا	۲۵۲

تذکرہ انتخابات کا مضمون ہے۔

علیہ

پیش لفظ

• پنجاب میں اردو زبان و ادب کی داستان بہت دلچسپ ہے۔ زبان کی تاریخ اس زمانے سے شروع ہوتی ہے جب پنجاب میں آریائی تہذیب پر اسلامی تہذیب کے اثرات کا آغاز ہُوا تھا۔ ھندوی اردو زبان کا ہی قدیم نام ہے۔ اور تذکرہ لباب الالباب کے مُصنف محمد عوفی کے بیان کے مطابق مسعُود سعد سلمان کا ھندوی دیوان یعنی اردو کا پہلا دیوان سرزمینِ پنجاب میں تخلیق ہُوا۔ غزنوی دَور سے لیکر آج تک پنجاب نے اردو کی نشوونما میں جو خدمات انجام دی ہیں ان کا مفصل تذکرہ تاریخ ادب اردو کا حصّہ ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اردو ادب کی کوئی تاریخ بھی اسکو تفصیل سے بیان نہیں کرتی۔ اس کا سبب محققین کی بے اعتنائی نہیں بلکہ کم اطلاعی ہے۔ تاریخی اعتبار سے پنجاب کی سرزمین سالہا سال بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ رہی اور قلیل عرصے کے سوا پنجاب کو سیاسی مرکز ہونے کا موقع نہیں مِلا۔ یہی سبب ہے کہ یہاں کے اہلِ قلم دادِ سُخن پانے کیلئے ہندوستان کے سیاسی مراکز کا رُخ کرتے تھے اور ان کی ادبی کاوشیں دلی و لکھنو کے ادبی کام کا محض ضمیمہ قرار پاتی تھیں۔

پاکستان کے معرضِ وجُود میں آنے کے بعد مُلک کے ہر خطے کی ادبی روایات کا جائزہ لینا ناگزیر ہو گیا ہے۔ حافظ محمود شیرانی اور بعض دُوسرے محققین کی کاوشیں اردو کی نشوونما میں پنجاب کے حصّے پر روشنی ڈالتی ہیں لیکن اس پر ابھی مزید تحقیق کی گنجائش ہے۔ یہ مقالہ اس بحث میں ایک ادنیٰ کوشش ہے۔

۱۸۴۹ سے ۱۹۱۴ تک کے جائزے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب ۱۸۴۹ سے پہلے کا تاریخی و ادبی پس منظر پیش کرتا ہے جس میں بعض معاصر

شہادتیں پہلی بار درج ہوئی ہیں۔ مولوی احمد بخش یکدل کے روزنامچے اسی سلسلے کی اہم کڑی ہیں۔ یکدل نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پیش کردہ اہم منصب کو ٹھکرا دیا تھا اور انگریزوں کے ساتھ مفاہمت کو قومی وقار کے منافی سمجھا تھا۔ اسی لحاظ سے یہ یادداشتیں ایک مستند اور غیر جانب دار مورخ کی عینی شہادت کا درجہ رکھتی ہیں۔ اسی طرح تحقیقات چشتی اور تاریخ مخزن پنجاب بھی معاصر دستاویزیں ہیں۔ اُنیسویں صدی کے تاریخی واقعات پر افغانی مورخ وکیلی فوفلزائی نے محققانہ بحث کی ہے۔ ان کی کتاب درۃ الزمان کو بھی پہلی بار بُنیادی ماخذ کے طور پر برتا گیا ہے۔ سکھ دَور کے ادیب اور شاعر جو اپنے زمانے میں اُردو ادب کے فروغ کا باعث تھے اور جن کی ذات اپنے ادبی ماحول پر اثر انداز رہی اس باب میں نمایاں نظر آئیں گے۔ نتھو شاہ حکیم، مولوی احمد بخش یکدل، فقیر نورالدین منور اور راجہ دینا ناتھ سوز کی شخصیت اور خدمات کا تذکرہ بھی پہلی بار اس مقالے میں ملے گا۔ اشرف نوشاھی اور احمد یار مرالوی جیسے اہم شعراء جن کا ذکر اردو ادب کی تاریخوں میں نہیں اس باب میں پہلی دفعہ روشناس ہوئے ہیں۔ مولوی احمد بخش یکدل کا اردو دیوان اور فقیر نورالدین منور کے اردو کلام کے نمونے بھی نوادر میں شمار ہو سکتے ہیں۔

دُوسرے باب میں ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۷ء تک کے ادبی اور فکری کوائف ہیں۔ الحاق پنجاب اور جنگِ آزادی کے درمیان کم فاصلہ ہے۔ لیکن اس تھوڑے عرصے میں کئی اہم واقعات رونما ہوئے، جن کا اثر اردو ادبیات پر نظر آتا ہے۔ سکھوں کے زوال سے لیکر انگریزی حکومت کے قیام تک کی داستان معاصر شہادتوں کے ذریعے بیان کی گئی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ادبی رجحانات کا تفصیلی

جائزہ بھی اس مقالے کا اہم حصہ ہے۔ سکھ دور میں اُبھرنے والے جواں اُردو شعراء
اور ادباء امرناتھ اکبری، نور احمد چشتی اور مُفتی غُلام سرور لاہوری اردو ادب کی
تاریخ میں ہر لحاظ سے مناسب جگہ پانے کے لائق تھے۔ اس باب میں ان میں سے
بعض ایسے نام بھی نظر آئیں گے جن کی تحریریں صرف خطی نسخوں کے دفینوں میں گُم
ہیں۔ مثال کے طور پر میاں ولی محمد حجام اور علمی لو عمر پیشے کے اعتبار سے شاعر نظر
نہیں آتے لیکن بیکدل کی بیاضوں نے ان کے اردو کلام کو جا بجا خراجِ عقیدت پیش
کیا ہے۔ دُوسرا باب ان لکھنے والوں کو قارئینِ ادب سے روشناس کراتا ہے۔ اس
باب کے ماخذ بھی تقریباً تازہ ہیں مثلاً سفرنامہ امین چند، یادگارِ چشتی اور دیوان
اکبری۔ یہاں اس دور کی اردو صحافت کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اردو کی ترقی
میں معاصر اخبارات کی خدمات کو فراموش نہیں کیا گیا۔ اس دور سے اردو کی نشوو
نما کیلئے پنجاب کو مرکزی حیثیت حاصل ہونا شروع ہوتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی
میں اہلِ پنجاب نے جو قربانیاں دیں ان پر بھی اس باب میں ضمنی بحث موجود ہے۔

تیسرا باب، اُنیسویں صدی میں پنجاب کے اردو ادب پر محاکمے کیلئے مخصوص
ہے۔ پنجاب پر انگریزی قبضے کے ساتھ ایک نئے فکری، سیاسی، اجتماعی اور ادبی
دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس باب میں ۱۸۵۷ء کے بعد کی صورتِ حال میں پیدا
ہونے والے اردو ادب کو بعض نو دریافت ماخذ کے ذریعے زیرِ بحث لایا گیا ہے۔
اردو ادب کو مختلف موضوعات کے اعتبار سے جانچا گیا ہے۔ یہ دراصل اُن اجتماعی
اور فکری تحریکوں کا ردِ عمل ہیں جو نئی سیاست کے زیرِ اثر وجود میں آئی تھیں۔ اس
دور میں اصلاحِ معاشرہ اور قومی بیداری کے رجحان نے اردو نظم اور نثر کو بھی بعض
عمدہ شاہکار دیئے ہیں۔ معاصر اخباروں کی مدد سے کوشش کی گئی ہے کہ قارئین

ادب کو ان سے مجموعی طور پر آشنا کیا جائے۔ انجمن پنجاب کے قیام، سرگرمیوں اور اس کے تحت پیدا ہونے والے ادب کا ایک نئے زاویے سے جائزہ لیا گیا ہے۔ جس میں مسلمان اہلِ قلم کی کاوشوں کو خاص طور پر اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس باب میں اردو ادب کو جن نئے ماخذ کے تحت جانچا گیا ہے ان میں انیسویں صدی کے اخباروں کا ذکر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ سرسید کی پنجاب میں آمد اور اس کے ادبی ردِعمل پر رفیقِ ہند نہ صرف معاصر بلکہ سب سے وقیع ماخذ ہے۔ مولوی اقبال علی کا لکھا ہوا سرسید کا سفرنامہ پنجاب عرصہ دراز تک نایاب ہونے کے سبب سے قارئین کی نظر سے اوجھل رہا ہے۔ مولوی صاحب نے سرسید کے سفر کا صرف تعلیمی اور اصلاحی رُخ پیش کیا ہے۔ لیکن اس مقالے میں معاصر شہادتوں کے ذریعے سرسید کے سفر پنجاب کے دیگر پہلوؤں پر بھی مفصل بحث موجود ہے۔ مخصوصاً اس دور کے اردو ادب پر سرسید کے افکار اور نظریات کا جائزہ قارئین کو بالکل نئے زاویے سے نظر آئے گا۔

چوتھا باب ۱۸۸۲ء سے ۱۹۱۰ء تک ہے۔ یہ دور سیاسی اور ادبی اعتبار سے پنجاب کے لئے اہم تھا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۲ء تک قومی اور فکری آزادی کی جو کوششیں بروئے کار لائی گئیں ان کا نتیجہ اس دور میں برآمد ہوا۔ اس عہد کا بیشتر مواد "رفیقِ ہند" کے کالموں پر مشتمل ہے۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں پنجاب یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ پنجاب کی تعلیمی اور فکری زندگی کا نئے پہلو سے آغاز ہوتا ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے قیام اور اہلِ پنجاب کے اس قومی ادارے کے استقبال کی روداد بعض تازہ ماخذ کے ذریعے دہرائی گئی ہے مولوی عبدالرشید کا پنجاب یونیورسٹی پر کتابچہ اس سلسلے میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس رپورٹ کے مطالب یونیورسٹی کے بارے بعض نئی اور اہم معلومات مہیا کرتے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے تحت ہونے والی علمی و ادبی کاوشوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ نیز

یونیورسٹی کے اساتذہ اور اس گہوارہ علم سے فیض یاب ہونے والے ادیبوں کی اردو خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

پانچواں باب گذشتہ ابواب کا خلاصہ بھی ہے اور بعض کوائف کا اضافہ بھی — یہ دراصل پہلے چار ابواب کے ادبی نتائج پر محاکمہ ہے اور بعض توضیحات جو پہلے ابواب میں تسلسلِ مطالب میں رکاوٹ سمجھی گئیں اس باب میں انکو جگہ دی گئی ہے۔

مقالے کی تیاری میں رہنمائی کیلئے میں اپنے محترم اُستاد ڈاکٹر ناظر حسن زیدی کی سپاس گذار ہوں جن کے مشورے ہر قدم پر میرے لئے خود اعتمادی کا باعث رہے۔

میں اُستاد گرامی قدر جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کی بھی احسان مند ہوں کہ اُنہوں نے اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازا اور رہنمائی فرمائی۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری، پبلک لائبریری، لائبریری سنٹرل میوزیم لاہور اور دیال سنگھ لائبریری کے عملے اور سرپرستوں کی بھی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے فراہمی مواد میں ہر ممکن امداد کی۔

ممتاز اختر مرزا

(ممتاز گوھر)

پنجاب میں اُردُو ادب کا اِرتقاء

نگران

مقالہ نگار

ڈاکٹر ناظر حسن زیدی
ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

ممتاز اختر مرزا (ممتاز گوھر)

پہلا باب

تاریخی اور ادبی پس منظر

پنجاب میں اُردو ادب کا اِرتقاء (۱۸۴۹ء — ۱۹۱۴ء)

پہلا باب

تاریخی اور ادبی پس منظر:

مہاراجہ رنجیت سنگھ ۵ / جولائی ۱۷۹۹ء مطابق ۱۳ / صفر ۱۲۵۵ھ کو فاتح کی حیثیت سے لاہور میں داخل ہُوا۔ کرونولوجی آف ماڈرن انڈیا کے مُصنف نے لکھا ہے کہ شاہ زماں نے رنجیت سنگھ کو جاگیر کے طور پر لاہور بخش دیا تھا۔ اس تاریخی واقعہ کو مُختلف مورخین نے اپنے اپنے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ جن میں بعض کے بیانات دلچسپی سے خالی نہیں۔

مولوی نور احمد چشتی[1]، مُفتی غلام سرور لاہوری[2] اور ڈاکٹر محمد باقر[3] سب نے اتفاق کیا ہے کہ شاہ زماں جب افغانستان میں اپنے خلاف بغاوت کی خبر سُن کر پنجاب سے بعجلت واپس ہُوا تو اُس کی بارہ توپیں دریائے جہلم میں گر گئیں۔ بادشاہ نے رنجیت سنگھ سے فرمائش کی کہ وہ اِن توپوں کو نکلوا کر کابل بھجوا دے اور اس کے بدلے میں اسے لاہور پر قبضہ کرنے کی اجازت ہے۔ مُفتی غلام سرور کے بقول رنجیت سنگھ نے بارہ توپوں میں سے آٹھ نکلوا کر شاہ زماں کو بھیج دیں اور چار اپنے قبضے میں رکھیں۔

۱۔ مولوی نور احمد چشتی، تحقیقات چشتی۔ لاہور۔ پنجابی ادبی اکیڈمی ۱۹۶۴ء، ص ۱۴۱

۲۔ مُفتی غلام سرور لاہوری، تاریخ مخزن پنجاب، لکھنو، نول کشور ۱۸۷۷، ص ۴۸۴

۳۔ Muhammad Baqir, Lahore Past and Present, Lahore. Punjab University Press, 1952 P ۲۰۴

صاحب درۃ الزمان عزیزالدین وکیلی فوفلزائی نے اس واقعہ کو ایک خاص پس منظر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس سے پہلے کہ اپنی طرف سے کوئی رائے پیش کی جائے فوفلزائی کا بیان درج کیا جاتا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"درسال ۱۱۷۹ھ ق اشرف الوزراء شاہ ولی خان فوفلزائی بحضور اعلیٰحضرت احمدشاہ غازی بعرض رسانید کہ مردم سکھان ہموارہ تمرد می ورزند و شاید از اثر مخالفت و عناد با حکام افغان کارھا بدان سر میسر سانند، اگر زمام حکومت لاہور بدست یک نفر از خود آن گروہ سپردہ شود، بہتر است تا موافق مزاج مردم خود رفتار کنند و ہم گروہ شرارت پیشہ خود را مطیع سلطنت درانی گردانند چون عرض و التماس اشرف الوزراء خالی از صواب نبود اعلیٰحضرت احمدشاہ غازی یک نفر ھندو را کہ امرسنگھ نام داشت بحضور خواست تا مقام راجاھی را از برای تصدی و انقیاد و قوم او بسپارد و چون امرسنگھ . . . . نیز وقتی از حضور اعلیٰحضرت احمدشاہ غازی بلقب مہاراجہ سرفراز شدہ بود، ھم بطریق وراثت و ہم بر حسب پیشنہاد وزیر شاہ ولی خان شائستہ لقب مہاراجہ و حکومت قوم سکھان، امرسنگھ مد نظر گرفتہ شد[۵] . . . . امرسنگھ بمقابل احسان بزرگ اعلیٰحضرت شاہنشاہ درانی یک لکھ روپیہ نقد برکاب خاقان اعظم بنوع نثار رکاب بعرض تقدیم رسانید و در ختم باریابی و

۴۔ Syed Muhammad Latif. History of the Punjab, New Dehli. Eurasia Publishing House, 1964. P. 286

۵۔ عزیزالدین وکیلی فوفلزائی۔ درۃ الزمان فی تاریخ شاہ زمان، کابل، دارالسلطنۃ۔ ۱۳۳۷ھ ص ۳

کسب مباہات از حضور مبارک ملتجی شد تا محبوسین را کہ از طرف شاہنشاہ والا جاہ از قرب و جوار سہارنپور و متھرا گرفتار و محکوم بہ حبس فرمودہ اند رہا فرمایند اعلیٰحضرت . . . . احمد شاہ محبوسین اہل ہنود را بہ مروی امرسنگھ راجہ رہا و مجّانا عفو فرمود ۔ ازین سبب مردم ہنود نام امرسنگھ را " بندی چھوڑ " یعنی محبوس رہا، شہرت دادند ۔[6] "

" در عہد سلطنت اعلیٰ حضرت زمان شاہ غازی کہ شہریار مبرو دسیاست ہای پسندیدہ جد بزرگوارش را در ہر رشتۂ تعقیب و تائید کردن میخواست نظر بہ تلفاتی کہ در حملات مکرر در سرزمین پنجاب و لاہور بآن نواح دادہ شد و آن گروہ ناعاقبت اندیش، پنجاب را خراب و درہم میکردند برای رفع خسارات اہل ہنود چنین سیاست را پسندید تا یک نفر زعیم با عزم آن طائفہ را کہ مطیع سلطنت ـــ زمان شاہی و نسبت سائر حکام محلی سکھان بیشتر ہوا خواہ و در اظہار اطاعت بایں دولت خوبتر سبقت جستہ باشد بحیث مہاراجہ حکم برقراری فرمان سرافرازی بنامش اصدار بخشد . . . . . حین و رود موکب ہمایونی در پشاور چون قبل از آن عزم داشت مانند راجہ امرسنگھ شخصی را از ان طائفہ لقب مہاراجہ بخشید درین فرصت المرضاء خاطر خطیر شاہنشاہ زمان بدان قرار یافت تا رنجیت سنگھ را کہ چند بار در لاہور بحضور اعلیٰحضرت موصوف لشرف رکاب بوسی حاضر شدہ . . . لازم فرمود کہ از میان نفر زعیم مشہور موجودۂ سکھان آن جوان صاحب

---

۶ ـ عزیز الدین وکیلی فوفلزائی ـ درۃ الزمان فی تاریخ شاہ زمان، کابل، دار السلطنۃ ۱۳۳۷ھ ص ۱۲۲

رشادت و فراست را در قطار آنہا امتیاز بخشیدہ بحکومت لاہور و بلقب
مہاراجہ سرگباشی سرافراز فرمائید[7]"۔

فوفلزائی کے بیانات کا تفصیلی تجزیہ کرنے کا یہ موقع نہیں ۔ لیکن یہ حقیقت ہے
کہ مُصنف نے واقعات کو جس آنکھ سے دیکھا ہے اس میں تاریخی بصیرت کم اور عقیدت زیادہ
ہے ۔ اگر احمد شاہ کے حکم کو دیکھا جائے تو اس سے زیادہ کچھ نظر نہیں آتا کہ احمد شاہ نے
ایک لاکھ رُوپے کے عوض مہاراجگی کے خطاب کو امر سنگھ کے ہاتھ فروخت کر دیا اور
امر سنگھ نے ایک لاکھ رُوپیہ ادا کر کے "بندی چھوڑ" کا نیک نام اور سہارنپور اور متھرا کے
سکھوں کی حمائت اور قوت اپنے لئے حاصل کی جس کی اہمیت احمد شاہ کے دیئے ہوئے خطاب
مہاراجگی سے بہر نوع زیادہ تھی ۔ چنانچہ امر سنگھ نے بادشاہ کے قندھار پہنچتے ہی خود
مختاری کا فیصلہ کر لیا ۔ فوفلزائی لکھتے ہیں ۔

"بعد از عرصہ کمی کہ اعلیٰ حضرت احمد شاہ درانی از کشور ہندوستان
بصوب اشرف البلاد قندھار نزول اجلال فرمود، امر سنگھ راجہ
راجگان نظر بعداوت دیرینہ ای کہ از پیش با افغانہای مقیم
مالیر کوٹلہ داشت، موقع یافتہ بمقابلہ برخاست[8]"

اسی طرح شاہ زماں کا رنجیت سنگھ کو خطاب مہاراجگی دینا یا نہ دینا، تاریخ کی روشنی
میں رنجیت سنگھ کیلئے کسی خاص نفع یا نقصان کا باعث نہ تھا البتہ اس عمل سے شاہ زماں
کو ایک فائدہ ضرور ہوا کہ اس کی فوج پنجاب سے مراجعت کے وقت نہ صرف سکھوں کی لوٹ مار

---

۷ ۔ عزیز الدین وکیلی فوفلزائی ۔ درۃ الزمان فی تاریخ شاہ زمان، کابل، دار السلطنۃ ۱۳۳۷ھ ص ۱۲۳ ۔ ۱۲۴
۸ ۔ درۃ الزمان ۔ ص ۱۲۲

سے محفوظ رہی بلکہ رنجیت سنگھ نے بادشاہ کی آٹھ توپیں بھی کابل پہنچا دیں، جہاں تک رنجیت سنگھ کے لاہور میں کئی مرتبہ شاہ زماں کے رکاب بوس ہونے کا تعلق ہے یہ بات واضح ہے کہ اس کے پیچھے فوفلزائی کے نظریے کے برعکس عقیدت سے زیادہ مطلب برآری کام کر رہی تھی۔ شاہ زماں کا رنجیت سنگھ کے نام فرمان کا اصل متن کم یاب ہے لیکن اس کا ذکر سر لیپل گرفن تک کے ہاں موجود ہے[9]۔ البتہ اس کے ساتھ اس نے بجا طور پر اس بات کا اقرار بھی کیا ہے کہ "شاہی خطاب کا عطیہ محض بے سود تھا، سکھ سردار کو اپنے قوتِ بازو سے قبضہ حاصل کرنا پڑا۔"[10]

بہرحال رنجیت سنگھ نے شاہ زماں کے نام نہاد فرمان اور کاغذی خطاب کی آڑ میں لاہور پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اگر اس کی تکمیل میں لیارانی سدا کور کا مردانہ وار ارادہ اور جنگی سوجھ بوجھ کارفرما نہ ہوتی اور لاہور کے داخلی حالات رنجیت سنگھ کے لیے مساعد نہ ہوتے تو شاید رنجیت سنگھ اتنی آسانی سے کامیاب نہ ہو سکتا۔ داخلی حالات کے موافق اور مساعد ہونے کے اسباب سید محمد لطیف نے تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ اس جگہ بطور خلاصہ اس قدر بیان کرنا کافی ہو گا کہ لاہور کے تین حاکموں یعنی لہنا سنگھ، گوجر سنگھ اور سوبھا سنگھ کے جانشینوں چیت سنگھ، صاحب سنگھ اور مہر سنگھ نے اہلِ لاہور پر عرصۂ زیست تنگ کر رکھا تھا۔ لاہور کے مسلمانوں کی حالت بالخصوص قابلِ رحم تھی۔ ان پر مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ شاہ زماں کے لیے جاسوسی کا بھی الزام تھا۔ اس مشبہے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لاہور کے کھتریوں نے میاں بدر الدین کے داماد میاں عاشق محمد

۹۔ سر لیپل گرفن، رولرز آف انڈیا، حیدر آباد، جامعہ عثمانیہ، مترجم نظیر حسین فاروقی ۱۹۲۲، ص ۱۱۶

۱۰۔ ایضاً

پر شاہ زماں سے خط و کتابت کا الزام لگایا اور تائید میں جعلی دستاویزیں پیش کیں۔ لاہور کے ایک حاکم چیت سنگھ نے میاں عاشق محمد کو گرفتار کر لیا۔ میاں بدرالدین، میاں حکم الدین چودھری ککا اور اشرف خاں جیسے عمائدین نے پوری کوشش کی لیکن شفاعت قبول نہ ہوئی مایوس ہو کر رنجیت سنگھ سے مدد کی درخواست کی گئی۔ میاں عاشق محمد کی گرفتاری محض ایک بہانہ تھی۔ ورنہ حاکمانِ لاہور کے مظالم اور لوٹ کھسوٹ سے رعایائے لاہور کا کوئی طبقہ بھی امن میں نہ تھا۔ یہی سبب ہے کہ رنجیت سنگھ کے پاس جو اپیل تحریری صورت میں بھیجی گئی اس پر میاں بدرالدین، میاں حکم الدین، محمد باقر، محمد طاہر، مفتی محمد مکرم اور میر شادی وغیرہ کے ساتھ ساتھ حکیم حاکم رائے اور بھائی گوربخش سنگھ جیسے معزز ہندوؤں اور سکھوں کے دستخط بھی نظر آتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ تاریخی پس منظر سے پوری طرح واقف ہونے کے باوجود مفتی غلام سرور نے میاں حکم الدین باغبان کے اقدام کو "سازش" سے تعبیر کیا ہے۔ مختصر یہ کہ رنجیت سنگھ دیسی مہینے کے مطابق ۵ ہاڑ سمت ۱۸۵۶ کو لطیف کے بقول صبح آٹھ بجے اور پروفیسر محمد شجاع کی اطلاع کے مطابق[11] پو پھٹے لوہاری دروازے سے لاہور میں داخل ہوا۔ فقیر وحیدالدین نے لاہور میں داخلے کی تاریخ دس محرم قرار دی ہے[12] اور لکھا ہے

۱۱۔ نقوش لاہور نمبر، لاہور: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۶۲، ص ۱۱۴

12- The operation, which took place during the night following the tenth day of Muharram in 1299 was a masterpiece of strategy.
Faker Syed Waheed-ud-din, the Real Ranjit Singh, Karachi. Lion Art press, 1945, P 465

لاہور کے عوام عاشورے کے جلوسوں کو دیکھنے میں مصروف تھے اور رنجیت سنگھ کا حملہ اس عدم توجہی میں خاصہ مناسب تھا۔ مورخین کی اکثریت کے خلاف ۱۲ صفر کو دس محرم کہنے کے بجائے اگر عاشورے کی جگہ چہلم کے مراسم کی موجودگی بیان کی جاتی تو زیادہ صحیح تھا کیونکہ عاشورے اور چہلم کے مراسم تاریخ معین سے بہت پہلے شروع ہو جاتے ہیں۔ (فقیر وحیدالدین کی کتاب میں ایسے اشتباہ کثرت سے دکھائی دیتے ہیں) رنجیت سنگھ نے لاہور کے شکست خوردہ حاکموں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا۔ مہر سنگھ کو اجازت دی کہ اپنی منقولہ جائیداد لیکر چلا جائے۔ چیت سنگھ کو موضع وانیکی لبطور جاگیر ملا۔

۷ رجولائی ۱۷۹۹ء کو رنجیت سنگھ نے قلعے میں دربار کیا جسمیں تمام عمائدین لاہور شریک ہوئے۔ جن لوگوں نے نئے راجہ کی کامیابی کے سلسلے میں خدمات انجام دی تھیں، مستحق انعام قرار پائے۔ حکیم دین کو "بابا" کا خطاب ملا اور لبعض دوسرے لوگوں کو "صاحب" اور "مہربان" کے خطاب عطا ہوئے۔

لاہور پنجاب کا صدر مقام ہونے کے اعتبار سے رنجیت سنگھ کی پُورے پنجاب پر فرمانروائی کا پیش خیمہ تھا۔ لاہور پر قبضے کے وقت رنجیت سنگھ کے سامنے پنجاب کا جو سیاسی نقشہ موجود تھا اس کی ایک جھلک یُوں نظر آتی ہے۔

قصور	حاکم	نظام الدین خاں
امرتسر	"	گلاب سنگھ بھنگی
ملتان	"	مظفر خاں سدوزئی
ڈیرہ	"	عبدالصمد خاں
منکیرہ، بھوت، بنوں	"	نواب شاہنواز
ٹانک	"	سرور خاں کٹی خیل

ڈیرہ غازی خاں، بہاولپور	حاکم	بہاول خاں داؤد پوترہ
جھنگ	"	احمد خاں سیال
پشاور	"	فتح خاں بارک زئی
کشمیر	"	عظیم خاں
قلعہ اٹک	"	جہاندار خاں وزیر خیل
کانگڑہ	"	راجہ سنسار چند
چنبہ	"	راجہ چڑت سنگھ
ہوشیار پور، کپورتھلہ	"	فتح سنگھ
گجرات	"	صاحب سنگھ بھنگی
وزیر آباد	"	جودھ سنگھ
دلاور گڑھ	"	باوا کرا سنگھ سوڈھی

ان میں سے جسا سنگھ رام گڑھیہ، گلاب سنگھ حاکم امرتسر، صاحب سنگھ حاکم گجرات، جودھ سنگھ حاکم وزیر آباد اور نظام الدین والئ قصور کے درمیان دوستانہ معاہدہ ہو چکا تھا اور ایک دوسرے کے سیاسی اور ملکی مفاد میں شریک ہونے کے عہد و پیمان تھے۔ رنجیت سنگھ کے لاہور پر قبضے کی خبر سن کر یہ تمام سردار اپنی فوجوں کو جمع کر کے لاہور کے قریب موضع بھسین میں اکٹھے ہو گئے۔ رنجیت سنگھ شاید اس متحدہ حملے کی تاب نہ لا سکتا۔ لیکن خوش قسمتی سے کثرت مے نوشی کے سبب امرتسر کا والی گلاب سنگھ اچانک مر گیا۔ تمام سردار اس افسوسناک حادثے سے متاثر ہو کر اپنے اپنے شہروں میں واپس چلے گئے اور رنجیت سنگھ اس خطرے سے محفوظ رہا۔ اس کے بعد رنجیت سنگھ نے پنجاب کے تمام بڑے شہروں پر قبضہ کر کے اور تقریباً تمام مسلمان اور سکھ سرداروں کو ماتحت بنا کر پنجاب میں ایک مستحکم سکھ سلطنت

کی بُنیاد رکھی۔ جس کا صدر مقام لاہور اور مذہبی مرکز امرتسر تھا۔ پنجاب میں جو مختلف قومیں آباد تھیں ان میں مُسلمان اکثریت میں تھے۔ لیکن نادر شاہی اور احمد شاہی حملوں میں جہاد کے نام پر سکھوں کا جو قتلِ عام ہُوا، اس کے ردِ عمل نے پنجاب کے مسلمانوں کو سکھوں کے ظلم و ستم کا شدت سے نشانہ بنایا۔ سکھ گردی سے پنجاب کی جو حالت تھی اس کی مختلف جھلکیاں پنجاب سے متعلق معاصر اور غیر معاصر تاریخوں میں موجود ہیں۔ پھر سکھوں کی مُسلمان دشمنی نادر شاہی یا احمد شاہی حملوں سے ہی متعلق نہیں بلکہ اس کا تاریخی رشتہ گرو تیغ بہادر کا اورنگ زیب کے ہاتھوں قتل اور گرو گوبند سنگھ کے دو بیٹوں کی سرہند میں ہلاکت سے ملتا ہے۔ سکھوں کی عسکری تنظیم اور پاہل کی رسم جو گرو گوبند سے شروع ہُوئی دراصل گرو تیغ بہادر کے قتل کا مُسلمانوں سے انتقام لینے کیلئے تھی۔ واہ گرو کی فتح یعنی کیسی خالصے کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل۔ یہ سکھ گرو گوبند سنگھ کے جانشین ہوں یا بارہ مثلوں کے سردار، ان کے ایمان اور نصب العین میں کوئی فرق نہیں۔ سکھ سکھ ہے خواہ بھنگی مثل کا چھیا سنگھ ہو یا رامگڑھیا مثل کا جسّا سنگھ، خواہ کنہیا والوں کا کاہن سنگھ ہو، نشان والوں کا سنگت سنگھ، فیض اللہ پوریہ مثل کا کپور سنگھ ہو یا سکر چکیہ مثل کا بدھ سنگھ، سب کا نصب العین مُسلم کُشی اور گرو تیغ بہادر کے قتل کا انتقام لینا تھا۔

لاہور کے مسلمانوں نے بھنگی سکھوں کے ظُلم سے تنگ آکر سکر چکیہ سردار رنجیت سنگھ کا پنجاب کے صدر مقام پر قبضہ قبول کیا۔ لیکن وہ اس بات سے شاید بے خبر تھے کہ سکھ ہونے کی حیثیت سے چیت سنگھ، صاحب سنگھ اور رنجیت سنگھ میں کوئی فرق نہیں۔ رنجیت سنگھ نے پنجاب میں اپنی سلطنت کی اساس اسی مذہبی فلسفے پر رکھی۔ جو سکھ ہونے کی حیثیت سے اسی کے قول اور عقیدے کا حصّہ تھی۔ چنانچہ اس نے لاہور پر قبضہ پاتے ہی اپنا سکّہ

ضرب کرایا جسپر مندرجہ ذیل شعر کندہ تھا۔

دیگ و تیغ و فتح و نصرت بیدرنگ
یافت از نانک گرو گوبند سنگھ

گرو گوبند سنگھ کا نام رنجیت سنگھ کے سیاسی عقیدے اور پالیسی کی کاملاً وضاحت کر دیتا ہے۔ یہ سیاسی پالیسی رنجیت سنگھ کے پنجاب پر چالیس سالہ دور حکومت کی بنیاد تھی۔

رنجیت سنگھ نے اپنے جن محسنوں کو "بابا" "صاحب" اور "مہربان" کے خطاب دیئے تھے ان کی عاقبت بھی بخیر نہ ہوئی۔ چنانچہ بابا محکم دین پر بھاری جرمانہ عائد کر کے رنجیت سنگھ نے مسلمانوں کے احسان کا جسطرح بدلہ چکایا اور "بابا" کے خطاب کا جسطرح احترام کیا، تاریخ کے اوراق اسکو فراموش نہیں کر سکتے۔ یہی حال "صاحبوں اور مہربانوں" کا ہوا۔

سید محمد لطیف نے لکھا ہے کہ رنجیت سنگھ نے ۱۸۰۱ء میں مہاراجہ کا لقب اختیار کیا لیکن اگر فوقلزائی کی روایت کو صحیح مان لیا جائے تو مہاراجگی کا خطاب رنجیت سنگھ کو شاہ زماں کی طرف سے لاہور کے ساتھ ہی جاگیر میں ملا تھا۔

رنجیت سنگھ نے تھوڑے ہی عرصے میں پنجاب کی مختلف ریاستوں پر فتح حاصل کر کے ایک قدرت مند فرمانروا کی حیثیت اختیار کرلی۔ قصور، چنیوٹ، سیالکوٹ، کانگڑہ، امرتسر، جالندھر، نکودر، مالیر کوٹلہ، نرائن گڑھ، قلعہ شیخوپورہ، گجرات، جموں، جھنگ، اُچ اور کشمیر وغیرہ اپنی سلطنت میں شامل کر کے ستلج سے پشاور تک اور بہاولپور سے کشمیر تک اپنے ملک کی سرحدوں کو پھیلا دیا۔ مہاراجہ ستلج کے پار بھی اپنا دائرہ سلطنت وسیع کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ایک تو انگریزوں کو اس کی متجاوز فتوحات پسند نہ تھیں اور دوسرے ستلج پار کی سکھ ریاستوں نے مہاراجہ کے خلاف انگریزوں سے پناہ کی درخواست کی جسے کمپنی کی عیارانہ سیاست نے تھوڑی سی تکرار کے

بعد قبول کر لیا۔

چنانچہ ۲۶ جنوری ۱۸۰۹ء کو مہاراجہ اور انگریزوں کے درمیان معاہدہ ہوا جس کی رُو سے ستلج کے اس طرف مہاراجہ اور اس پار انگریزوں کے زیر حمایت والیانِ ریاست قرار پائے۔ لیپل گرفن نے اس معاہدے کو مہاراجہ کی سیاسی بصیرت کی علامت قرار دیا ہے۔ سیاسی اعتبار سے اس معاہدے نے سکھوں کے مستقبل میں جو کردار بھی ادا کیا ہو، اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اس معاہدے کے بعد مہاراجہ کے لئے انگریزوں کی طرف سے کئی سال تک کوئی خطرہ باقی نہ رہا۔ اور مہاراجہ کو نہ صرف پنجاب اور سرحد کے مختلف حصوں میں اپنی سلطنت کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کا موقع ملا بلکہ مہاراجہ نے پنجاب کی اندرونی حالت کو بہتر بنانے پر بھی توجہ کی۔

مہاراجہ کی بعض مہلک اور نقصان دہ عادتوں میں ایک شراب خوری کی کثرت بھی تھی۔ لیپل گرفن نے لکھا ہے کہ

"اس کی پسندیدہ شراب اناج کی تیز مقطر شراب تھی۔ جس میں ماءاللحم افیون، مشک اور بہت سی دوسری مختلف جڑی بوٹیوں کی آمیزش ہوتی تھی۔ اس قسم کی شراب وہ سرِ شام اور شب کو بکثرت پیتا تھا[۱۳]"۔

اس کثرتِ شراب نوشی نے ۱۸۲۶ء کے قریب مہاراجہ کو اس قدر بیمار کیا کہ ذاتی طبیبوں کے علاوہ انگریزی معالجوں سے بھی رجوع کرنا پڑا۔ چنانچہ لیپل گرفن کے بقول فقیر عزیز الدین اور حکیم نعمود شاہ وغیرہ جیسے قابل طبیبوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر بھی مہاراجہ کے علاج میں کوشاں رہے۔ ان سب اطباء نے مہاراجہ کو شراب نوشی میں

۱۳۔ رولرز آف انڈیا (اردو ترجمہ) ص ۷۴

اعتدال پیدا کرنے کا مشورہ دیا لیکن مہاراجہ نے اس کی پرواہ نہ کی۔ ۱۸۳۳ء میں مہاراجہ پر پہلی دفعہ فالج کا حملہ ہوا۔ اس کا ذکر گرفن، سید محمد لطیف اور مفتی غلام سرور کے علاوہ مہاراجہ کے ممتاز معاصر مولوی احمد بخش یکدل نے بھی کیا ہے۔ یکدل کے بیان کے مطابق اس عارضے کی ابتداد اسہال سے ہوئی۔ طبیبوں کو علم ہو گیا تھا کہ مہاراجہ کسی مہلک مرض میں مبتلا ہو رہے ہیں لیکن کسی نے مہاراجہ کو اصلی مرض کے آغاز سے باخبر نہیں کیا۔ یکدل اگست ۱۸۳۳ء کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"سرکار والا لبفالج گرفتار است۔ دربار نمی کنذ و ایں را مفصل خواہم نگاشت[۱۴]"

اس کے بعد اس اجمال کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں۔

"زبانی سوکھاری وا سے کالیستھ دریافت شدہ کہ سرکار والا بسیار ماندہ است بلکہ باسہال گرفتار است وچوں افیونی را اسہال بسیار بودی باشد، موجب حیرت است، واز بازو تا شتا لنگ درد است؛ وچوں بمبطر یح فقیر عزیز الدین مالش کنانیدہ۔ عجب بلائے گرم بودہ کہ تمام دمالیر و بثو۔ رات پیدا شدند۔ و آنچناں سوزش می کند کہ بہ تحریر در نمی آید وایں آغاز فالج است۔ وحالانکہ حکماء برای تسکین سرکار والا ایں حرف را برزبان نمی آرند[۱۵]"

۹ کاتک ۱۸۹۰ ب کو مہاراجہ صحت یاب ہو کر کرسی پر بیٹھا اور گیارہ ماہ کاتک مذکور کو اس صحت یابی کی خوشی میں جشن منایا گیا۔ یکدل کی اصل عبارت یہ ہے:

"روز دسہرہ۔ ۹ کاتک ۱۸۹۰ ب سرکار والا برکرسی نشستہ۔ متوجہ حصول نذور

۱۴-۱۵- مولوی احمد بخش یکدل۔ بیاض (قلمی) شمارہ ۲ (ذاتی)

شدند و هر یکی را بدلا ساد استمالداد نوازش مہاراجانہ نواختند وچون آن روز در لاہور نیز گرد و غبار بدرجہ اتم گردید . . سرکار والا بملاحظہ کمال سوار نشدند وچوں از یک ماہ کامل سوار نشدہ بودند در دل خطور کرد کہ امروز ضرور است علی العموم بار دادن ـ لہذا بر دیو دھر باغ شامیانہ ایستادہ کردہ نشستند ـ وجمہار دست لبستہ روبرو ایستادہ شدند و نذور نہادند ـ بہر یکی التفات فرمودند و فرمودند کہ حال الحمد کار صحت است ـ روز یازدھم کاتک منادی بموجب پروانہ سرکار والا کردند کہ ہر دوکاندار چراغاں نماید ـ چوں امروز قطرات در ترشیح بود چندی توقف نہادند و نیز صبح شلق اتواپ اجزاب بدرجہ تمام شدہ وچوں سرکار والا غسل صحت فرمودند تہنیت و مبارکبادی ہم رو داد ـ"[۱۶]

خطرے کی اس گھنٹی نے بھی مہاراجہ کو بیدار نہیں کیا اور اس نے اپنی عیش وعشرت اور مخصوصاً شراب خوری کی عادت میں بے اعتدالی کو ترک نہ کیا چنانچہ مارچ ۱۸۳۷ء میں اپنے پوتے نونہال سنگھ کی شادی پر مہاراجہ نے انگریزی کمانڈر انچیف کے ساتھ مل کر اسقدر شراب پی کہ اس کی زندگی موت کی سرحد تک پہنچ گئی ۔
(اس شادی کی تفصیلات فقیر وحید الدین نے اپنے خاندانی کاغذات کی مدد سے بیان کی ہیں[۱۷])
اس مے نوشی کا نتیجہ ۱۸۳۸ء میں مہاراجہ پر فالج کے دوسرے حملے کی صورت میں ظاہر ہوا ـ یہ حملہ نومبر کے مہینے میں ہوا جبکہ مہاراجہ فیروز پور میں انگریز گورنر لارڈ آکلینڈ سے افغانستان کی مہم پر گفتگو کر کے واپس آ رہا تھا سید محمد لطیف اور سر لیپل گرفن نے اسے فالج کا حملہ کہا ہے ـ مفتی غلام سرور کا کہنا ہے کہ مہاراجہ کو گردن کی

۱۶ـ بیاض یکدل شمارہ ۲

17- Real Ranjit singh. P 185 - 194
History of the Punjab P 475 - 479

شریانیں سُکڑ جانے کے سبب سے لقوے کا مرض ہو گیا تھا۔ اور فقیر وحید الدین کا بیان ہے کہ مہاراجہ بُخار کی شدّت میں مُبتلا تھا اور اس کے ناک اور منہ سے خون آ رہا تھا۔ درباری حکماء نے توجہ اور علاج میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ بقول لیپل گرفن فقیر عزیز الدین اپنے ہاتھ سے مہاراجہ کو دوا پلاتے تھے۔ لیکن مہاراجہ کا وقتِ آخر آن پہنچا تھا۔ چنانچہ ۲۷ جون ۱۸۳۸ء کو مہاراجہ فوت ہو گیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی چالیس سالہ حکومت، پنجاب کا بظاہر ایک سنہری دور تھی اور بظاہر اسلیئے کہ باطنی اعتبار سے یہ دورِ طلائی ایک بہت بڑے سیاسی المیے کا پیش خیمہ تھا۔ مہاراجہ کے دورِ حکومت کو نمایاں طور پر تین پہلوؤں سے دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۔ سیاسی۔ ۲۔ تمدنی۔ ۳۔ علمی و ادبی۔

پہلے دو پہلو ہمارا اصلی موضوع نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کا بیان مختصر اور اشارتاً ہو گا البتہ تیسرے پہلو یعنی پنجاب کے علمی و ادبی ماحول پر آئندہ سطور میں تفصیل سے گفتگو کی جائے گی اور یہی اس باب کا اصل موضوع ہے۔

جہاں تک پنجاب کے سیاسی ماحول کا تعلق ہے۔ مہاراجہ کی سیاسی بصیرت کو تقریباً تمام مورخین نے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ سر لیپل گرفن نے مہاراجہ کو جنگ اور صلح ہر دو موقعوں پر باہوش اور بیدار مغز پایا ہے۔ مہاراجہ کی سلطنت کے ایک طرف انگریز اور دوسری طرف افغان تھے۔ افغانوں کی خانہ جنگی اور اندرونی انتشار سے مہاراجہ سمجھ چکا تھا کہ یہ سلطنت زوال کی طرف جا رہی ہے اور اس سے پنجاب میں لوٹ مار کرنے یا پنجاب کے لشکر کو وقتی طور پر جنگ کی زحمت دینے کے سوا اور کوئی خطرہ نہیں۔ انگریزوں کی طاقت کو مہاراجہ جانتا تھا اور اپنے ارادے سے مُقابلہ کرتے ہوئے ان سے کسی قسم کا نہ تو خوف محسوس کرتا تھا اور نہ ہی ان کی طاقت کو اپنے سے اتنا زیادہ سمجھتا تھا کہ ان سے نبرد آزما ہو سکے یا جنگ کے موقع پر ان سے

شکست کھائے۔ اسلئے یہ جاننے کے باوجود کہ ستلج پار انگریز کا نفوذ ہے۔ مہاراجہ نے اس پار کی ریاستوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا تھا[18]۔ انگریزوں سے شرطیں منوانے کیلئے انگریزی سفیر مٹکاف کو حراست میں لئے رکھا تھا وغیرہ۔ لیکن جس بات نے مہاراجہ کو انگریزوں سے دوستی اور صلح کا معاہدہ کرنے پر مجبور کیا وہ انگریزوں کی طاقت نہیں بلکہ مہاراجہ کی اپنی کمزوری تھی مہاراجہ کو معلوم تھا کہ لوٹ کھسوٹ سے بنی ہوئی سلطنت مستحکم بنیادوں پر استوار نہیں ہوتی۔ ستلج پار کے راجوں کی نفرت تو ایک طرف خود پنجاب اور اس کے ملحق علاقوں کے چھوٹے چھوٹے فرمانروا اور راجے جنہیں مہاراجہ نے فرمانروائی کے حق سے محروم کر دیا تھا مہاراجہ سے خائف ضرور تھے، لیکن مہاراجہ سے قلبی محبت یا ارادت نہ رکھتے تھے۔ یہ اندرونی نفرت کی چنگاریاں غصب شدہ ریاستوں کے خاکستر کے نیچے مہاراجہ کی سلطنت کے کونے کونے میں دبی ہوئی تھیں۔ مہاراجہ جتنا انگریزوں سے صمیمی ہوتا گیا انگریز اتنا ہی رطوبت بن کر اس کے ملک کی بنیادوں میں بیٹھتا گیا۔ بالآخر اس دکھاوے کی نیازمندی نے اپنی برعکس قوت اختیار کر لی کہ مہاراجہ کی آنکھ بند ہونے کے بعد پنجاب کی یہ پُرجلال سلطنت انگریزی سیلاب کے سامنے پانی کا ایک بلبلہ نظر آنے لگی۔ انگریزوں نے مہاراجہ کی چالیس سالہ حکومت کے دوران اپنے ایلچیوں، منشیوں، افسروں، مخبروں اور نام نہاد سیاحوں کے ذریعے پنجاب کے نہ صرف راز حاصل کر لئے تھے بلکہ مہاراجہ کے بعض قابلِ اعتماد اور نامآور سرداروں کو بھی ورغلانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس اجمال کی تفصیل آئندہ باب میں بیان ہوگی۔

تمدنی اعتبار سے مہاراجہ کا پنجاب ایک سرسبز باغ تھا۔ دیکھنے کیلئے بھی اور دکھانے کیلئے

۱۸۔ اس اجمال کی تفصیل سر لیپل ایچ گرفن کی کتاب رولرز آف انڈیا کے اس حصے میں موجود ہے جو رنجیت سنگھ کے دور سے شروع ہوتا ہے۔

بھی۔ مہاراجہ نے قیام سلطنت کے بعد پنجاب کے مختلف حصوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی تھی جسمیں احساس فتح و غرور اور احساس خوشحالی دونوں موجود تھے۔ مہاراجہ کی شخصیت خود رنگا رنگ خصائص کا مجموعہ تھی۔ قدرت نے ایک کریہہ المنظر انسان کے وجود میں ایک بہادر شجاع، عالی ہمت، فاتح، عاشق، متعصب، جابر، درویش اور عیاش کی روح ڈال دی تھی۔ شخصیت کے ان تضادات کو لیپل گرفن نے سب سے زیادہ خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ مہاراجہ کے زمانے میں پنجاب کے تمام شہروں میں لاہور اور امرتسر کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ لاہور پنجاب کا دارالحکومت اور عروس البلاد تھا۔ رعایا کے مختلف طبقوں اور گروہوں میں سکھوں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ پھر ہندوؤں کو۔ لیکن چونکہ پنجاب میں مسلمانوں کی تعداد باقی سب مذاہب کے مقابلے میں زیادہ تھی لہذا تالیف و قلوب کیلئے کبھی کبھی مسلمانوں پر بھی توجہ ہو جاتی تھی۔ فقیر وحیدالدین نے "رئیل رنجیت سنگھ" میں مہاراجہ کی جو عادلانہ اور غیر متعصب تصویر بنانے کی کوشش کی ہے وہ حقائق سے بہت دور ہے۔

اس زمانے میں علم و دانش بیشتر فارسی زبان کے ذریعے حاصل ہوتے تھے۔ لہذا فارسی زبان سے آشنائی مہذب و تعلیم یافتہ ہونے کی علامت تھی۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی اہمیت اس دور میں یہ تھی کہ وہ فارسی کے استاد ہوتے تھے۔ لہذا ہندوؤں، سکھوں یا دوسری قوموں میں کوئی شخص بھی جو پڑھنا لکھنا چاہتا تھا اسے مسلمان معلمین کے سامنے زانوے ادب تہہ کرنا پڑتا تھا۔

انیسویں صدی کے ہندوستان میں دہلی کی مرکزی اسلامی حکومت آخری سانس لے رہی تھی چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور بادشاہتیں انگریزوں کے رحم و کرم پر تھیں۔ قریب و جوار کی مسلمان حکومتیں جیسے ایران یا افغانستان اندرونی انحطاط اور بیرونی سازشوں کا شکار ہو رہی تھیں اس صورت حال میں پنجاب کے مسلمانوں کو ملکی سیاست میں کیا اہمیت دی جا سکتی تھی علاوہ ازیں

مہاراجہ نے بھی انگریزوں کی طرح پنجاب کی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی۔ لہذا انگریز اور مہاراجہ کی متوازی پالیسی کے مطابق مسلمانوں کو سیاسی اہمیت دینا دوبارہ دردِ سر مول لینے کے برابر تھا۔

مہاراجہ کا دور اہلِ پنجاب کے لئے امن اور خوشحالی کا ایک ٹھہرا ہوا لمحہ تھا جسے قدرت نے چالیس سالوں پر محیط کر دیا تھا۔ پنجاب کے مختلف شہروں سے قطع نظر دارالخلافہ یعنی لاہور کی چند جھلکیاں اس امر کی وضاحت کیلئے دلچسپی کا باعث ہوں گی۔ یہاں بیلدار چشتی اور نور احمد چشتی کے بیانات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں باپ بیٹے مہاراجہ کے دورِ حکومت کے چشم دید گواہ ہیں۔ بسنت کے روز مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مادھولال حسین کے مزار پر حاضر ہونے کا منظر نور احمد چشتی نے یوں بیان کیا ہے۔

"جب اس طرح فوج جم جاتی تو بوقت دو بجے سواری مہاراجہ کی قلعہ سے نکلتی اور تمام مخلوقات جو منتظر دیدارِ سرکار ہوتے تھے۔ جب آواز توپہا و شلک سلامی سنتے تو ہشاش بشاش ہو کر خندہ زن ہوتے۔ جب مہاراجہ کی سواری میلہ میں آتی تو یہ لطف ہوتا تھا کہ اب اس کی یاد میں چشم آب ہو آتی ہے۔ کم از کم ساٹھ ستر ہاتھی اور چار پانچ سو گھوڑے با زین ہائے مرصع و تمام ڈیرہ سواران مارماری اور دو رجمنٹ پیدل اردل جلو میں ہوا کرتی تھیں۔ اور شاہ سے گدا تک ہر شخص بسنتی پوش ہوا کرتا تھا۔ بلکہ در و دیوار بسنتی نظر پڑتے تھے اور مہاراج مٹھیاں روپوں کی بھر بھر کر تصدق کرتے اور پھینکتے ہوئے تا مزارِ انوار حضرت مادھولال حسین کے پہنچتے اور بعدہٗ سواری سے اتر کر پا پیادہ ہو بارادت تمام مع رؤسائے عالی مقام ننگے سر برہنہ، خانقاہ کے دروازے سے اندر جاتے پھر شلک سلامی کی ہوتی۔ پھر گیارہ سو روپیہ نقد مع دوشالہ بسنتی خانقاہ پر نذر چڑھا کر جبیں سائی کے بعد رونق افزائے خیمہ شاہی ہوتے تھے۔ وہاں

عرش سے فرش تک تمام لبنتی اشیاء موجود و حاضر ہوتی تھیں پھر حسبِ معمول خود، یعنی ایک بروز دوسہرہ اور دوسرے بروز بسنت تمام مُلازمین سے نذریں علیٰ قدر مراتب لیکر با خلعت ہائے فاخرہ ہر ایک کو سرفرازی بخشتے تھے۔ اور پھر عطر و عنبر، گُلال بطور شروع جشن ہولی اڑتا تھا۔ پھر لالہ رخاں حوروش یعنی تمام طوائفان لاہور و امرتسر جو حسب الحکم اس روز وہاں حاضر ہوا کرتی تھیں۔ مجرائے شاہانہ ادا کرکے نوبت بنوبت بتقریب تفریح طبع سرکار ناچ میں مشغول ہو کر بانعامات گوناگوں سے سرفراز ہُوا کرتی تھیں اور جو نذر کا روپیہ و اشرفی اس روز مہاراج کی خدمت میں جمع ہوتا تھا وہ بتقریب انعام یوم بسنت خدمت گاراں کو تقسیم ہو جاتا تھا۔ بلکہ ماسوا اس کے ایک ایک ماہ کی تنخواہ تمام فوج سواری و پیادہ کو بطور انعام تقسیم ہوتی تھی۔ جس وقت غروبِ آفتاب قریب ہو جاتا تو پھر سواری مہاراج کی بوضع سابقہ برآمد ہوا کرتی تھی اور اس طرح روپیہ پھینکتے ہوئے داخلِ قلعہ ہوتے تھے[19]۔"

دسہرے کا منظر بکیدل کے گذشتہ اقتباس میں بیان ہو چکا ہے۔ بکیدل کے بقول دسہرے کا جشن رام باغ امرتسر میں منایا جاتا تھا۔ نذرانے لئے جاتے اور داد و دہش کی جاتی ھر جشنوارے پر شہروں میں چراغاں ہوتا تھا۔

سکھوں کی اخلاقی حالت بے حد پست تھی۔ اس کی تفصیل لیپل گرفن کے ہاں موجود ہے اس نے لاہور کے بازاروں میں رنجیت سنگھ اور اس کے امراد کی کھُلم کھُلا رنگ رلیوں کی قابلِ توجہ

۱۹- تحقیقاتِ چشتی۔ ص ۲۴۴

تصویریں پیش کی ہیں۔ اور لاہور کے بازاروں کو پکاڈلی سے تشبیہ دی ہے۔

مہاراجہ نے میدان طوائف کیوجہ سے بازاری طبقے کو جو اہمیت دی تھی اس سے رعایا خوش نہ تھی چنانچہ یکدل نے اس دور حکومت کو "ایک جگہ کنجر شاہی سے تشبیہ دی ہے[20]"۔ مہاراجہ کی طوائف نوازی اور شراب خوری کی عادت اس کے امراء نے بھی اپنا رکھی تھی۔ لیپل گرفن نے لکھا ہے کہ "اس کے اکثر درباری باستثنا فقیروں کے مسلمان خاندانوں کے اس کے خوش کرنے کو مے نوشی کے جلسوں میں شریک رہتے تھے اور اس کے مثل ہمیشہ بدمست رہتے تھے[21]"۔

علمی و ادبی لحاظ سے مہاراجہ کا دور خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ باوجود اس کے کہ مہاراجہ مطلقاً جاہل اور بے سواد تھا۔ اس کا دربار اور محیط علم و ادب سے خالی نہ تھا۔ اس کے ملک میں علم کے ہر شعبے پر معلومات رکھنے والے افراد موجود تھے۔ پنجاب کے تقریباً تمام بڑے شہروں میں علم و دانش کی کمی نظر نہ آتی تھی۔ مورخین نے لکھا ہے کہ مہاراجہ اپنے درباریوں اور بے تکلف افراد کے ساتھ پنجابی اور مسلمان ایلچیوں، سیاسی شخصیتوں اور اجنبیوں کے ساتھ اردو میں بات چیت کرتا تھا۔ اس کے دربار کی زبان فارسی تھی۔ خط و کتابت، وقائع نگاری اور فرامین کی زبان بھی یہی تھی۔ مہاراجہ فارسی سے بطور کامل بہرہ مند نہ ہونے کے باوجود فرامین اور مکاتیب خود سنتا تھا۔ اور بعض اوقات قابل وضاحت، تشنہ یا قابل اعتراض مقامات کی طرف منشیوں اور مسؤلین کی توجہ مبذول کرواتا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہاراجہ فارسی سے بالکل نابلد نہ تھا۔

اس کے درباری ماحول میں علماء و فضلاء کی کمی نہ تھی۔ وزیروں میں فقیر عزیز الدین، فقیر

۲۰۔ بیاض یکدل۔ شمارہ ۱۳

۲۱۔ رولرز آف انڈیا (اردو ترجمہ) ص ۷۰

نور الدین اور فقیر امام الدین جیسے شعراء اور دانشمند موجود تھے۔ راجہ دینا ناتھ اور اس کی اولاد جیسے فارسی دان ادیب اور شاعر تھے اور وکلا میں منکیرہ میں نواب راجہ کے وکیل سکندر خاں خاکوانی جیسے صاحبِ علم و دانش موجود تھے۔ جس کے بارے میں بیگدل نے لکھا ہے کہ:

"حضرت سکندر خاں ملتانی خاکوانی چہ تبحر در میان طریقت داشت وکنارہ از معاصی و اجتناب از زخارف و خود را موظف سحر و شام داشتی سبحان اللہ چہ کلام وچہ اشراف بر اسرار قلوب[۲۲]"

غیر درباری حلقے میں بھی علماء اور فضلاء کی کثرت تھی اس جگہ ان بہت سے ہندو علماء کے ذکر سے فی الحال صرف نظر کرتے ہیں جو سنسکرت اور مذہب ہنود کے علوم سے بہرہ مند تھے اور محض ان مسلمان فضلاء کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔ جن کی خدمات نے اس زمانے کے علمی، ادبی اور اجتماعی ماحول کو متاثر کیا۔ ان شخصیات کو تین اہم گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ معلمین۔ ۲۔ مورخین۔ ۳۔ شعراء و ادباء۔

علمی مراکز اور ممتاز معلمین میں سے بعض کا ذکر کنہیا لعل کی تاریخ لاہور، مولوی احمد بخش بیگدل کی بیاضوں، مولوی فقیر محمد جہلمی کی حدائق الحنیفہ، مولوی غلام سرور کی خزینۃ الاصفیا اور مولانا علم الدین سالک کے مقالے بعنوان علمائے کرام، دینی مدرسے، مطبوعہ نقوش لاہور نمبر میں موجود ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا تذکرہ اس جگہ بے محل نہ ہوگا۔

۱۔ مولوی غلام رسول۔ ۲۔ مولوی غلام اللہ۔

کنہیا لعل نے لکھا ہے کہ یہ دونوں علماء مولاں طوائف کی مسجد میں درس دیتے تھے۔ "ہزاروں طلباء اور درویش دور دور ملکوں سے وہاں آکر تعلیم پاتے۔ تمام زمانہ بہ دل و جان

۲۲۔ بیاض بیگدل شمارہ ۱۳

اُن کا ادب کرتا تھا۔ ہنود و اہل اسلام سب ان کے شاگرد کہلاتے[۲۳]"۔

مدرسے کا ذکر کرتے ہُوئے کنہیا لعل نے اضافہ کیا ہے کہ ہزاروں ہندو، مسلمان اکمیں تعلیم پاتے تھے۔ اس مدرسے میں فارسی، عربی، صرف و نحو، منطق، معانی، حدیث، تفسیر کی تعلیم ملتی تھی۔ اور صاحب مدرسہ کا ادب تمام پنجاب کے لوگ کرتے تھے[۲۴]۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ مولوی غلام اللہ کو دربار میں تعظیماً برابر کرسی دیتا تھا۔ مولوی غلام رسول اور مولوی خلیفہ غلام اللہ کے لائق فرزند خلیفہ حمید الدین نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ سقوط پنجاب تک یہ مدرسہ قائم تھا۔ مولوی حمید الدین فاضل اجل اور فقیہ تھے۔ انگریزوں نے ان کو لاہور کا قاضی مقرر کیا تھا۔

۳۔ مولوی جان محمد لاہوری۔

ان کا مدرسہ مسجد نور ایمان والا میں تھا۔ بقول کنہیا لعل یہ مدرسہ علوم دینی پڑھانے میں ضرب المثل تھا۔ مولوی صاحب موصوف کی وفات کے بعد ان کے بیٹے مولوی محمد فیض اور ان کے بھائی مولوی محمد افضل نے اس وظیفہ دینی کو جاری رکھا۔ مولانا علم الدین سالک کا بیان ہے کہ پنجاب کا کوئی ضلع ایسا نہ تھا جو مولوی جان محمد لاہوری کے فیض سے محروم رہا ہو۔ آپ کی تصانیف میں زبدۃ التفاسیر، رسالہ اثبات خلافت امیر معاویہ، شرح قصیدہ بردہ، شرح قصیدہ امالی، معراج نامہ، رسالہ حرمت تمباکو، رسالہ عدم فرضیت حج وغیرہ مشہور ہیں۔

آپ ۱۱۹۳ھ ۱۷۷۹ء میں پیدا ہُوئے۔ ۱۰ محرم ۱۲۶۸ھ ۱۸۵۱ء کو وفات پائی[۲۵]۔

۲۳۔ کنہیا لعل، تاریخ لاہور، لاہور، وکٹوریہ پریس، ۱۸۸۴ء، ص ۱۴۱

۲۴۔ ایضاً ص ۵۲

۲۵۔ نقوش لاہور نمبر ص ۵۳۲

۴ - مولوی غلام محی الدین بگوی۔

بگو ضلع جہلم کے رہنے والے تھے۔ محرم ۱۲۰۳ھ ۱۷۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ حافظ حسن سے ناظرہ قرآن پڑھا۔ آپ کا قرآن پاک حفظ کرنے کا کرامت آفریں قصہ مولوی فقیر محمد جہلمی نے بیان کیا ہے۔ آپ نے پہلے موضع بگہ میں اور پھر لاہور میں آکر لال مسجد میں مدرسہ جاری کیا۔ اور تیس سال تک درس دیتے رہے۔ ۳۰ر شوال ۱۲۷۳ھ ۱۸۵۷ء کو فوت ہوئے۔[۲۶]

۵ - میاں فضل اللہ۔

یہ بزرگ بھوانی داس کلال اور لبش سنگھ کے دیوان خانے میں درس دیتے تھے۔ ہندو اور مسلمان سب درس میں شامل ہوتے تھے۔ عہد مہاراجہ کے ممتاز مورخ اور عالم مولوی احمد بخش یکدل نے انہی سے قرآن پڑھا۔ مولوی یکدل اپنے زمانہ طالب علمی کو یوں بیان کرتے ہیں۔

"مادرم بمکتب میاں فضل اللہ از قوم خوجہ فرستادی و او در خانۂ بھوانی داس کلال و لبش سنگھ نشستی و گلاب سنگھ وغیرہ ہم خواندندی"[۲۷]

۶ - مولوی غلام حسین چشتی۔

لاہور میں لوہاری دروازے کے اندر درس دیتے تھے۔ مولوی نور احمد چشتی کے بقول دیوان بھوانی داس اور خاندان چوپڑہ کے ہندو طلبا کے علاوہ مہاراجہ کے وزیر خارجہ اور معتمد فقیر عزیز الدین کے بیٹے فقیر چراغ الدین انہی کے شاگرد تھے۔

۱۲۵۲ھ تک دیوان اجودھیا پرشاد، دیوان بیج ناتھ اور دیوان شنکر ناتھ کے خاندان آپ کے شاگرد رہے۔ دیوان امرناتھ اکبری نے لکھا ہے۔

---

۲۶ - مولوی فقیر محمد جہلمی، حدائق الحنفیہ، لکھنؤ، نول کشور، اکتوبر ۱۹۰۶ء، ص ۴۷۸

۲۷ - بیاض یکدل شمارہ ۱۳

11249

"عم لالہ کوار ناتھ از فیضان عام سرمایہ دانش و صفوت مولوی غلام حسین چشتی بتربیت علم و حلم فائیز شدند۔"[۲۸]

مولوی صاحب ۱۰ صفر ۱۲۶۰ھ مطابق ۲۹ فروری ۱۸۴۴ء کو فوت ہوئے۔[۲۹]

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور کو اگر تاریخ نویسی اور وقائع نگاری کا دور کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا۔ اس دور سے متعلق جو تاریخی آثار اب تک دستیاب ہوئے ہیں بے شمار ہیں ۔۔۔ ان تحریروں میں سے بھی جو پاکستان کے ذاتی یا ملی کتابخانوں میں موجود ہیں۔ بیشتر ہمارے علم میں ہے لیکن گمان کیا جا سکتا ہے کہ لاتعداد کتابیں اور تحریریں اب بھی پردۂ گمنامی میں ہوں گی جو یا تو بھارت کے ذاتی یا قومی کتابخانوں میں دفن ہیں یا یورپ کے دفینوں میں غائب ہو چکی ہیں۔ ان آثار میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں۔

عمدۃ التواریخ	تصنیف	سوہن لال سوری
ظفرنامہ	"	امرناتھ اکبری
تاریخ پنجاب	"	بوٹے شاہ
عبرت نامہ	"	مفتی علی الدین
حالات ضلع لاہور	"	مفتی تاج الدین۔
رنجیت نامہ	"	احمد یار مرالوی

روزنامچہ احمد بخش یکدل جو ۲۲ بیاضوں پر مشتمل ہے۔

روزنامچہ فقیر عزیز الدین ابن فقیر غلام محی الدین نوشتہ ثانی۔

۲۸۔ دیوان امرناتھ اکبری "ظفرنامہ رنجیت سنگھ" لاہور، پنجاب یونیورسٹی (مرتب) سیتارام کوہلی، ۱۹۲۸، ص ۱۸۵

۲۹۔ تحقیقات چشتی۔ ص ۲۱؛ بیاض یکدل شمارہ ۱۰۔

روزنامچہ فقیر نورشہ ثانی۔

کتاب المراسلات از فقیر عزیز الدین۔

روزنامچہ عہد مہاراجہ رنجیت سنگھ نوشتہ نامعلوم۔

مخزونہ مرکزی عجائب گھر لاہور۔

ان میں سے بعض کتابیں اردو میں اور بعض فارسی میں ہیں۔ اردو کتابوں کا تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا۔ اس جگہ فارسی کتابوں کے فنی اسلوب کے بارے میں اسقدر عرض کرنا ضروری ہے کہ ان میں سے بعض کتابیں ایسے مصنفین کی لکھی ہوئی ہیں جن کا تعلق دربار سے نہ تھا۔ لہٰذا ان کے بیان میں جرأت اور صداقت دونوں موجود ہیں۔ یہی فکری آزادی تاریخ نویسی کی جان ہے عبرت نامہ اور یکدل کی بیاض اس سلسلے کی بہترین مثالیں ہیں۔

اس دور کے اردو نثر کے نمونے کمیاب ہیں۔ البتہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے فارسی و اردو شعراء کے آثار کسی نہ کسی صورت میں بیاضوں یا دیوانوں کی شکل میں محفوظ ہیں۔ اگر یکدل، فقیر عزیز الدین اور ان کے دیگر معاصرین کی بیاضوں کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ رنجیت سنگھ کا دور فارسی اور اردو دونوں زبانوں کی شاعری سے بہرہ یاب ہے۔ مہاراجہ کے عہد کی درباری زبان فارسی تھی لہٰذا اس دور میں فارسی زبان میں شاعروں کی کثرت نظر آتی ہے۔ لیکن یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر فارسی گو شاعر کا اردو کلام بھی موجود ہے۔ یہ فارسی اور اردو کے شعراء پنجاب کے ہر گوشے میں موجود ہیں۔ ان میں سے اردو شعراء کا ذکر یکدل، کنہیا لعل، حافظ محمود شیرانی اور قاضی فضل حق نے تفصیل سے کیا ہے۔ یہاں چند ایک نمائندہ شعراء کا تذکرہ درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ نتھو شاہ۔

نام سید امیر بخش اور عرفیت نھو شاہ تھی۔ شاعر سے زیادہ طبیب کی حیثیت سے مشہور تھے چنانچہ کنہیا لعل اور مفتی علی الدین نے ان کا ذکر سکھ دور کے نامی طبیبوں میں کیا ہے۔ مولوی احمد بخش یکدل اور مفتی علی الدین ان کے علمی کمالات کا اعتراف کرتے ہیں۔ مولوی احمد بخش یکدل کی پیدائش کے سال یعنی ۱۲۱۲ھ تک زندہ تھے۔ یکدل اپنی ولادت کے ذکر میں نھو شاہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"صبحگاہان کہ سیّد امیر بخش عرف نھوّ شاہ کہ مرد عالم و کامل و بزرگاں پوش و حاکمان وقت بر دروازۂ او می رسیدند او شاعر نیز بود و صاحب علم۔ (قبرش بیرون خضری دروازہ، لب خندق تاحال موجود است) برای مبارک باد آمد جناب جد امجدی گوشگزار کردند و میر نھو صاحب دعا در حق بندہ کردند۔[۳۰]"

اسی طرح مفتی علی الدین لکھتے ہیں:

"وحید العصر بودند، باوصف اینگونہ مصارف بذات خود پیش آدمی سوال نمی کردند و بنا براں مرجع خواص و عوام لاہور و حکام وقت بودند۔[۳۱]"

نھو شاہ کی طبی تالیفات میں سے تبصرۃ الاطباء اور مرآۃ الشفاء کا ذکر کنہیا لعل نے تاریخ لاہور میں کیا ہے۔ افسوس ہے کہ لاہور کے خضری دروازے کے باہر نہ اب وہ خندق ہے جس کا ذکر یکدل نے کیا ہے اور نہ اس محترم شخصیت کے مزار کا کوئی نشان باقی ہے۔ قاضی فضل حق مرحوم نے اپنے مقالے "پنجاب میں اردو" میں نھو شاہ کی ایک اردو غزل نقل

۳۰۔ بیاض یکدل شمارہ ۱۲۔

۳۱۔ مفتی علی الدین۔ عبرت نامہ۔ جلد اول۔ لاہور۔ پنجابی ادبی اکیڈمی ۱۹۶۱۔ ص ۹۸۔

کی ہے۔ جو درج ذیل ہے:

نہ پوچھ خویش دلوں سے قصہ خموش ہو رہ ہلا نہ ہرگز
برنگ غنچہ لہو بھرے ہیں ہمارے لب کو کھلا نہ ہرگز
بھری ہیں خونِ جگر سے آنکھاں نہ چھیڑ تجھ کو قسم ہے تجھ کو
کہ ہیں لبالب یہ دونوں شیشے چھلک پڑیں گے ڈھلا نہ ہرگز
سوا ہمارے الیس ایک دل کے، وہ کون غنچہ کہ جس کے اوپر
صبا لگاوے بہت سے زورے پھر ایک دم بھی کھلا نہ ہرگز
سرشک عشاق کے تو ظالم کرے ہے پامال ڈر خدا سے
جنہوں کو آنکھوں میں ہم نے پالا انھوں زمیں پر رلا نہ ہرگز
رقیب سرکش بخواب سے ہو گیا ہے تو کیا ہوا ہے (آخر)
نہ چھیڑ اس کو وہ مردہ دل ہے سوا بھلا ہے جلا نہ ہرگز[۳۲]

تشبیہ اور استعارے کا عمدہ استعمال اور تخیل کی قابل توجہ کارفرمائی نے اس غزل کو پنجاب کی مخصوص شعری روایت کا حصہ بنا دیا ہے۔

۲۔ مولوی احمد بخش یکدل چشتی۔

لاہور کی ممتاز علمی شخصیت، مولوی غلام حسین چشتی کے بیٹے اور مولوی محمد ابراہیم چشتی کے پوتے تھے۔ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ سترہ سال کی عمر میں باپ کی جگہ درس تدریس کا کام شروع کیا۔ چوپڑہ خاندان کے ہندو لڑکوں کو فارسی پڑھاتے تھے۔ ۱۲۳۳ھ کے قریب منکیرہ کے وکیل سکندر خاں خاکوانی کی

۳۲۔ قاضی فضل حق "پنجاب میں اردو" مندرجہ پنجاب میں اردو ضمیمہ ۱۔
حافظ محمود شیرانی۔ لاہور، آئینہ ادب، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی ۱۹۷۲ء ص ۳۹۷۔

معرفت مہاراجہ رنجیت سنگھ سے متعارف ہوئے اور مہاراجہ سے ملک اور انعام حاصل کیا۔ انشا، نثر اور تاریخ نویسی میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ پیشے کے طور پر فارسی زبان کے استاد تھے۔ لیکن مختلف زبانوں پر تسلط حاصل تھا۔ شاعری اور معاصی کے علاوہ اہم ترین علمی و ادبی خدمات میں ان کا تینتیس بیاضوں میں روزنامچہ ہے، جسے انھوں نے خود 'جام جہاں نما' کا نام دیا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ یکدل کے روزنامچے میں اس دور کی علمی و ادبی، ثقافتی، سیاسی اور اجتماعی زندگی کی بھرپور تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔

یکدل اپنے زمانے کی مشہور شعری شخصیت تھے۔ مفتی غلام سرور نے گنج تاریخ میں اور کنہیا لعل نے تاریخ لاہور میں ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ یکدل اپنی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"احمد بخش در هر بیت[۳۳]، بموجب آئین داخل کردم و یکدل در شعر فارسی و نثر و مهر فخر الشعراء در پروانه و القاب چشتی نزد فقرا و در مسند القاب و در عوام بلفظ مولوی مشهورم۔ من عاجزم که شش نام دارم۔"[۳۴]

مولوی یکدل کثیر اولاد تھے، لیکن بیٹے کم زندہ رہے۔ مولوی صاحب کے جن بیٹوں نے بعد میں شہرت حاصل کی ان میں مولوی نور احمد چشتی مصنف یادگار چشتی و تحقیقات چشتی وغیرہ۔ اور مولوی محرم علی چشتی ایڈیٹر رفیق ہند کے نام قابل ذکر ہیں۔ دورہ رنجیت سنگھ کے اکثر قابل توجہ اردو، فارسی شعراء اور مشہور شخصیات یکدل کے شاگرد تھے۔ ان میں سے پران ناتھ بن کدار ناتھ، تن چند داڑھی والا، دیوان دینا ناتھ مدن ان کے بیٹے دیوان امر ناتھ اکبری مصنف

---

۳۳ - اصطلاح کے طور پر "بیت" پنجابی زبان کے شعر کو کہتے ہیں اسلیئے پنجابی میں مشاعرے کیلئے "بیت بازی" کی اصطلاح مشہور ہے۔

۳۴ - بیاض یکدل شمارہ ۱۳۔

ظفرنامہ رنجیت سنگھ، پنڈت مثودت نرائن اور پنڈت اجودھیا پرشاد کے بیٹے جنج ناتھ جیسے متقدر ہندو شعراء کے نام بھی لئے جا سکتے ہیں۔ مولوی نور احمد چشتی نے بھی شاعری میں یکدل کو اپنا استاد لکھا ہے

یکدل ۱۲۸۴ مطابق ۱۸۶۷ء میں فوت ہوئے۔

مفتی غلام سرور لاہوری نے 'دیدار حق با احمد بخش' سے مادۂ تاریخ منوبل کیا ہے[۳۵]۔ یہاں نمونے کے طور پر یکدل کی ایک اردو غزل درج کی جاتی ہے۔

بوٹے گل میں ہی ہوں اور بادِ صبا میں ہی ہوں
غنچہ دھر بھی میں غنچہ کشا میں ہی ہوں

گُل مازاغ سے ہیں چشم مکمل فتاب
اس کی پتلی کا جو دیوانہ بنا میں ہی ہوں

چشت کی خاک جو ہے میری مددگار و معین
اس کے دروازے کا مسکین وگدا میں ہی ہوں

لوٹتا ہوں کبھی خاک پر بن کر صوفی
وہ جو مجلس میں ہوا نغمہ سرا میں ہی ہوں

رندِ لاہور خرابات کا ساکن چشتی
اور نظر باز بڑا ایکدلا میں ہی ہوں[۳۶]

۳- فقیر سیّد نور الدین منور۔

منور لاہور کے مشہور فقیر خاندان کے رکن اور فقیر غلام محی الدین نوشہ ثانی کے

۳۵- مفتی غلام سرور لاہوری، گنجینہ سروری (معروف بہ اسم تاریخی) گنج تاریخ، لکھنو، نول کشور مارچ ۱۸۷۷ء ص ۲۱۷

۳۶- اوراق منسلکہ با گلستان سعدی (بخط) یکدل، میوزیم کراچی۔

تیسرے فرزند تھے۔ ان سے بڑے بھائی فقیر امام الدین اور سب سے بڑے فقیر عزیز الدین تھے جو فارسی کے عمدہ شاعر تھے اور آزاد اور رضا تخلص کرتے تھے۔ منور ۱۷۸۹ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی زبان میں دسترس حاصل تھی۔ اردو کلام پر قدرت ان کے کلام سے ظاہر ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں فقیر خاندان کو جو سیاسی عروج حاصل ہوا اس میں منور کی شخصیت بھی واضح نظر آتی ہے۔ وہ بعض روایات کے مطابق مہاراجہ کے وزیر خصوصی، گورنر لاہور، موتی مندر خزانوں کے کلید بردار، راجکماروں کے اتالیق، محلات کے محافظ اور مہاراجہ کے ذاتی معالج تھے[۳۷]۔

مولانا محمد حسین آزاد نے انہیں "لئیق اور صاحب علم" لکھا ہے[۳۸]۔

فقیر خاندان کی طرف سے دربار عالی کے نام سے مختلف دینی مدارس اور مراکز کی کفالت کیلئے جو ادارہ قائم تھا، فقیر سید عزیز الدین کی اطلاع کے مطابق منور اس ادارے کے بھی سرپرست تھے[۳۹]۔

مولوی احمد بخش یکدل نے منور کے سال وفات پر مولوی غلام رسول کا قطعہ تاریخ اپنے روزنامچوں میں درج کیا ہے۔ اس مادۂ تاریخ کی رو سے منور جمادی الثانی ۱۲۶۸ کو شنبے کے دن یعنی ۲۷ مارچ ۱۸۵۲ء کو فوت ہوئے[۴۰]۔

دیوان منور مطبوعہ پیکیجز لاہور میں ان کا صرف فارسی کلام شائع ہوا ہے۔ اردو کلام کا

۳۷۔ ڈاکٹر محمد لطیف، مقدمہ دیوان منور، لاہور، پیکیجز، ص ۲۰۔

۳۸۔ مقالات آزاد، مرتبہ آغا محمد باقر۔ لاہور۔ مجلس ترقی ادب ۱۹۶۶، ص ۱۳

۳۹۔ فقیر سید عزیز الدین۔ روزنامچہ خطی (عکسی نقل) لاہور۔ میوزیم لاہور۔

۴۰۔ بیاض یکدل شمارہ ۱۷، مملوکہ مسعود علی چشتی، لاہور۔

زیرِ نظر نمونہ دیوانِ منور کے خطی نسخے مملوکہ نیشنل میوزیم کراچی سے نقل کیا جاتا ہے ۔ راقم کے پیشِ نظر اس نسخے کا فوٹو سٹیٹ ہے ۔

یہ تمنا ہے میری حضرت شبیر سے آج
کہ تجھے تختِ سیادت پہ ہو سرسبز یہ تاج
جس کے مکھ آگے بنی ماہ کو کچھ دعویٔ نور
اور فقط نسبتِ خورشید ہے با تختۂ عاج
اور مرے واسطے ہو خاص بر اکلیم قلوب
وہ جو ہو حاصل و محصول و رسومات خراج
اور میری کشورِ دل سے ہو بحکم حیدر
لشکرِ وہم و غم و حزن کو اکثر تاراج
اور لقب سید سادات عطا کر ز کرم
کیجیۓ بیعت سیادت کا منور کو سراج[۴۱]

۴۔ فقیر عزیز الدین آزاد، رضا :

فقیر غلام محی الدین نوشہ ثانی کے سب سے بڑے بیٹے تھے ۔ ان سے چھوٹے فقیر نور الدین منور اور ان سے چھوٹے فقیر امام الدین جو قلعہ گوبند گڑھ کے حاکم تھے ۔ فقیر عزیز الدین مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر خارجہ تھے اور مختلف فوجی اور سیاسی مہموں میں شریک رہے ۔ سکھ دور سے متعلق تمام اہم تاریخوں میں ان کا ذکر موجود ہے ۔ بیرن چارلس ہیوگل نے اپنے سفر نامے میں فقیر عزیز الدین کی شرافت اور لیاقت کی تعریف کی ہے ۔ فقیر عزیز الدین کا انتقال دسمبر ۱۸۴۵ء میں ہوا ۔

---

۴۱ ۔ دیوانِ منور (خطی) عکسی نقل ف ۴۳

لیپل گرفن تذکرہ رؤسائے پنجاب میں لکھتے ہیں :

"فقیر عزیز الدین اپنے زمانے میں نہایت فصیح شخص مشہور تھا۔ اس کی تحریر بھی ایسی زبردست تھی جیسی کہ تقریر۔ سرکاری کاغذات جو اس نے اور اس کے بھائی نورالدین نے مرتب کئے تھے۔ مشرقی نقطۂ خیال سے فصاحت اور خوش مذاقی کا نمونہ ہیں۔ فقیر عزیز الدین جملہ فروغ علوم مشرقی میں کامل دستگاہ رکھتا تھا اور نیز تعلیم کا ایک فیاض اور ممیز حامی تھا۔"[۴۲]

فقیر عزیز الدین فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کا دیوان فقیر سید مغیث الدین مرحوم کے کتب خانے میں "دیوان آزاد شریف" کے نام سے موجود ہے۔ مرتب دیوان کے علاوہ ان کے کلام کی خاصی مقدار ان کے سیاسی روزنامچے میں بھی ہے جو سنٹرل میوزیم لاہور کی ملکیت ہے۔

فقیر عزیز الدین رضا اور آزاد دونوں تخلصوں سے شاعری کرتے تھے۔ آپ کے سیاسی روزنامچے اور دیوان ہر دو میں ان دونوں تخلصوں سے شعر موجود ہیں۔

کسے چراغِ شبستان دین و دولت نیست
بغیر ذات شریف عزیز الدین رضا[۴۳]

آہ امید تو غیر از یادِ حق
ای عزیز الدین رضا ہیچست ہیچ[۴۴]

---

۴۲ - سرلیپل ایچ گرفن۔ تذکرہ رؤسائے پنجاب لاہور۔ نول کشور، (مترجم) سید نوازش علی ۱۹۱۱ء ص ۴۹۳

۴۳ - روزنامچہ فقیر عزیز الدین ف ۴۶۳

۴۴ - فقیر عزیز الدین۔ دیوان آزاد شریف (خطی) لاہور، کتابخانہ فقیر خانہ ف ۲۷۔

ہمی آرزو کہ خبر اگنی مے دید ای آزاد
بجائے پائی سر در برافرازیو خود بمیدانم[۴۵]

چو پرسیدم ز ہاتف سال تاریخش بیک ناگہ
سروش غیب گفتا نسخۂ دیوان آزاد است[۴۶]

لیبل گرفن نے فارسی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"شاعر کی حیثیت سے عزیزالدین کا پایہ بہت بلند ہے۔ اس کی نظم جس کا رنگ صوفیانہ ہے اپنی سادگی اور بلند خیالی کے لحاظ سے بہت دلآویز ہے[۴۷]"

مثال کے طور پر دیکھئے:

روز عیدے کہ بہ غفلت گزرد چہ عید است[۴۸]
شب کہ بی یادِ خدا است چہا میگذرد
لیلۃ القدر ہماں است کہ در یادِ خدا است
روز نوروز کہ در ذکرِ خدا میگذرد

عمر آنست کہ در یادِ خدا میگذرد[۴۹]
وقت آنست کہ با اہلِ صفا میگذرد

۴۵۔ روز نامچہ فقیر عزیزالدین ف ۸۹

۴۶۔ دیوان آزاد شریف ف ۶

۴۷۔ رولرز آف انڈیا (اردو ترجمہ) ص ۸۴

۴۸۔ دیوان آزاد شریف ف ۳۰

۴۹۔ ایضاً ف ۳۲۔

اس کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا اردو کلام بھی اسی پایہ کا ہو گا۔ اگرچہ وہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ آپ کا وہ کلام جو روزنامچے میں ہے وہ آپ کے دیوان میں موجود نہیں موجودہ دیوان بھی غیر مطبوعہ ہے[۵۰]۔

۵۔ دینا ناتھ "سوز"

راجہ دینا ناتھ سوز، پنجاب کے مشہور مورخ اور شاعر دیوان امر ناتھ اکبری کا باپ اور ممتاز دانشمند مولوی احمد بخش یکدل کا معاصر دوست تھا۔ سوز دربار رنجیت سنگھ میں وزیر خزانہ کے عہدے پر فائز تھا۔ سر لیپل گرفن نے سوز کے بارے میں لکھا ہے:

"اسے پنجاب کا ٹیلرانڈ کہنا بجا و درست ہے۔ اس کی زندگی اور روش فرانس کے اس زبردست مدبر سلطنت سے بہت مشابہ تھی۔ بڑے بڑے انقلاب اس کے سامنے گذرے جنمیں اس کے احباب و سرپرست تلف ہو گئے۔ خاندانوں کو عروج و زوال ہوا لیکن اس کا بال بیکا نہ ہوا۔"

مولوی احمد بخش یکدل نے بھی اپنی بیاضوں میں راجہ دینا ناتھ سوز کی کہی ہوئی منظوم تاریخیں درج کی ہیں اور اس کے شاعر ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

مولوی احمد بخش یکدل کی تحریروں کے متفرق کاغذات میں ایک کاغذ پر اردو زبان میں درج ذیل مادۂ تاریخ مرقوم ہے۔ یکدل کی یادداشت کے مطابق یہ مادۂ تاریخ راجہ دینا ناتھ سوز نے موزوں کیا ہے۔ سوز کا کلام معاصر بیاضوں میں دفن ہے

۵۰۔ فقیر عزیز الدین کے اردو کلام کا نمونہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ لیکن ان کا اردو میں شعر نہ کہنا امکان سے باہر ہے۔ فقیر عزیز الدین اپنے زمانے کے شعری ماحول کے ایک اہم رکن تھے۔ لہٰذا معاصرین کے درمیان ان کا ذکر ناگزیر تھا۔

جن تک رسائی بے حد مشکل ہے۔ لہٰذا مذکورہ مادۂ تاریخ کو ہی ان کی اردو شاعری کے نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

جہاں کو کیوں نہ کرے نور عدل سے تسخیر
کہ آسمانِ جلالت کا ہے تو مہر منیر
بوقت پوچھنے تاریخ کے یہ بولا سروش
بنا ہے رنگ، عجائب بفضلِ ربِ قدیر

آخری مصرعے سے ۱۸۵۷ء کا سال بر آمد ہوتا ہے۔ تحقیقات چشتی وغیرہ کے مطالعے سے بھی یہ ثابت نہ ہو سکا کہ یہ مادۂ تاریخ امکانی طور پر کس واقعے سے متعلق ہے۔

ان شاعروں کے علاوہ لاہور میں دیگر قابلِ ذکر اردو شعراء درج ذیل ہیں۔ ان میں سے بعض کا ذکر کنھیا لعل نے تاریخِ لاہور میں اور اکثر کا ذکر بکڈل نے اپنے روز ناموں میں کیا ہے:

نواب غلام محبوب سبحانی۔ شیو ناتھ منظر۔
میاں نجابت اللہ نجات۔ فیض اللہ گوفتگر۔
فرید گھیسٹا۔ مرزا اکرم بیگ۔ محمد اکبر خاں خاور۔
نرائن داس مضطر۔ داور حسین خاں۔ تقی پشاوری
اور سرور منزلیا۔

یہ محض اردو شعراء کے نام ہیں۔ فارسی اور پنجابی کے شعراء کا ذکر بھی مفصل ہے لیکن اس جگہ اس کا محل نہیں۔

لاہور کے علاوہ پنجاب کے دیگر اہم شہروں میں بھی ممتاز اردو شعراء موجود تھے۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر خاص طور پر اہم ہے۔

۱۔ عبدالرحمان خلدی۔

وڈالہ سندھواں ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ آپ کا مزار اس شہر میں اب تک موجود ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں۔

"خلدی صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ فارسی میں انھوں نے خلدی نامہ اور بعض دیگر کتب لکھی ہیں۔ اردو میں بعض متفرق اشعار کے علاوہ ان کی ایک درسی کتاب بھی موجود ہے۔"[۵۱]

خلدی کی درج ذیل غزل حافظ محمود شیرانی نے مولوی محبوب عالم ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور کی قلمی بیاض سے نقل کی ہے۔

گھونگھٹ دور کر مکھ دکھا رے سجن — دل عاشقاں نہ ستا رے سجن

دیا حسن نے جوبن کرم سے تجھے — خدا کا کرم نہ چھپا رے سجن

جدائی تیری سے تو میں مر رہا — مرے حال پر کر دیا رے سجن

کوئی دن تو مل بیٹھو خلدی کے ساتھ

ہیں جگ موں رہنا سدا رے سجن[۵۲]

۲۔ نعمت اللہ پارسا:

۵۱۔ پنجاب میں اردو۔ مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی۔ ص ۳۴۰

۵۲۔ ایضاً ص: ۳۴۰

بٹالہ کے رہنے والے اور سلسلہ قادریہ کے بٹالوی سجادہ نشینوں میں سے احمد شاہ بن محمد شاہ متوفی ۱۲۲۴ ھ کے مُرید تھے۔ حافظ محمود شیرانی نے پروفیسر آذر اور قاضی فضل حق نے بیاض محمد یعقوب سے ان کا اردو کلام نقل کیا ہے۔ پارسا کی ایک اردو غزل درج ذیل ہے[53]۔

جس دل میں ہے غم یار کا عشرت کے تئیں کہہ کیا کرے
جو تشنہ لب دیدار کا شربت کے تئیں کہہ کیا کرے

جو عشق کی آتش میں جل طالب ہویا دیدار کا
دوزخ سیتی وہ ڈرتا نہیں جنت کے تئیں کہہ کیا کرے

لقمان و افلاطون جیسے دنیا سیتی جاتے رہے
دارو نہیں کوچھ موت کا حکمت کے تئیں کہہ کیا کرے

جب عشق خوباں از ازل ہے نعمت اللہ کے نصیب
تقدیر پھیرے کسطرح قسمت کے تئیں کہہ کیا کرے

۳۔ احمد یار مرالوی۔

مرالہ، تحصیل پھالیہ ضلع گوجرانوالہ کا ایک گاؤں ہے۔ احمد یار آخری عمر میں یہیں رہتے تھے۔ بزرگوں کا وطن سوہدرہ متصل وزیر آباد تھا۔ احمد یار کثیر التصانیف تھے۔ اکثر کتابیں پنجابی میں ہیں۔ ان کی سب سے اہم تصنیف مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور کی تاریخ "رنجیت نامہ" ہے جسے احمد یار نے راجہ گلاب سنگھ کی فرمائش پر شاہ نامۂ فردوسی کے وزن پر فارسی زبان میں نظم کیا۔ رنجیت نامہ۔ پروفیسر گلونت سنگھ کی کوشش سے امرتسر (بھارت) سے شائع ہو گئی ہے۔ دیباچہ میں مرتب نے احمد یار کے تفصیلی حالات درج کئے ہیں۔ قاضی فضل حق مرحوم

۵۳۔ پنجاب میں اردو۔ مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی۔ ص: ۲۹۶۔

نے اپنی مملوکہ بیاض سے ان کے مندرجہ ذیل دو شعر نقل کئے ہیں۔[۵۴]

جہاں سیتی پڑا غلغل تری افواج جوبن میں

عجب شمشیر ابرو سے شہیداں کوں بہار آئی

کہو بلبل قفس موں سوں نقل کر سیر گلشن کا

جہاں موں موسم شادی ہو یا رنگین بہار آئی

۴۔ اشرف نوشاہی۔

عزیز الدین نام اور اشرف تخلص تھا۔ اصلی وطن پانڈو کے تھا۔ لیکن اشرف نے منچر ضلع گوجرانوالہ میں بودوباش اختیار کرلی تھی۔ اردو، فارسی اور پنجابی کے پرگو شاعر تھے۔ فارسی کی مثنوی کنز الرحمت جو سلسلہ نوشاہیہ کے صوفیوں کا تذکرہ ہے، شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کا منظوم پنجابی ترجمہ بھی لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اردو دیوان مولانا شرافت نوشاہی نے مرتب کیا ہے۔ لیکن تاحال شائع نہیں ہوا۔ قلمی بیاضوں میں ان کا اردو کلام کثرت سے درج ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشرف مختلف اصناف میں کامیاب شاعر تھے۔ درج ذیل غزل قاضی فضل حق مرحوم کے مقالے "پنجاب میں اردو" سے نقل کی جاتی ہے۔

مجھ خرمن جان بیچ ایسی آگ پڑی ہے

خاشاک جو تھی غیر کی یکمشت اڑی ہے

دو تین ترے ساحر فرعون کے استاد

یا جادوے بنگالہ دیا پریم جڑی ہے

خورشید اوپر آ کے شفق ہو گئی ظاہر

یا خوب ترے ماتھے اوپر لال دھڑی ہے

۵۴۔ پنجاب میں اردو۔ مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی۔ ص۔ ۳۹۶۔

اشرف میں کیا لکھوں گا اس حسین کی تعریف

عین است اگر اس کوں کہا حور پری ہے[۵۵]

اس دور کے نثری نمونے بہت کم دستیاب ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پنجاب میں صرف شعر کیلئے اردو زبان کا زیادہ رواج تھا ۔ لیکن مولوی احمد بخش یکدل نے گلستان سعدی کو جب اپنے پوتے حامد علی چشتی کیلئے نقل کیا تو فارسی اشعار کا کتاب کے حاشیے پر اردو نثر میں ترجمہ لکھا یہ یکدل کی اردو نثر کا نمونہ ہی نہیں بلکہ یہ اس دور کی اردو نثر کے اسلوب پر بھی روشنی ڈالتا ہے اس کا ایک نمونہ درج ذیل ہے :

۱۔ "یہ وہ شخص ہے جس کے عشق میں تم مجھے ملامت کرتی تھیں"۔

۲۔ "یار میرے اس کی دوستی میں مجھے ملامت کرتے ہیں پر انھوں نے دیکھا نہیں، اگر دیکھتے تو ملامت نہ کرتے"۔

۳۔ "یہ وہی ہیں کہ ان کے واسطے رزق معین ہے"۔

۴۔ "پناہ مانگتا ہوں میں خدا ایسے فقر سے جو برا حال کرتا ہے، ہمسائگی ایسی سے جو دوست نہ رکھے"۔

۵۔ "فقر میرا فخر ہے اور فقر میرے سے ہے"۔[۵۶]

○

---

۵۵ ۔ پنجاب میں اردو ۔ مرتب ڈاکٹر وحید قریشی ص : ۳۹۰

۵۶ ۔ احمد بخش یکدل ۔ بیاض یکدل خطی ۔ (عکسی نقل) کراچی میوزیم

دوسرا باب

سنہ ۱۸۴۹ء سے سنہ ۱۸۶۴ء تک

دوسرا باب

پنجاب میں اُردو ادب ۱۸۴۹ سے ۱۸۶۴ء تک

رنجیت سنگھ نے ۱۷۹۹ء سے ۱۸۳۹ء تک پورے چالیس سال حکومت کی۔ اس دورِ حکومت میں پنجاب کو سیاسی اور تمدنی اعتبار سے قصرِ طلائی کی بجائے شیشے کا گھر کہنا مناسب ہوگا۔ شیشے کا گھر جو اپنی تمام تر رعنائیوں کے باوجود مخالف ضرب کی نہ تو خود تاب لا سکتا ہے اور نہ اپنے اندر رہنے والوں کیلئے امنیت کا ضامن ہوتا ہے۔ لوٹ کھسوٹ، خود غرضی، تعصب اور دوسروں کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھاکر بنائی ہوئی سلطنت کے استحکام اور پائیداری کا مہاراجہ کو خود بھی احساس تھا، مہاراجہ کے دوستوں اور حریفوں کو بھی اس کا علم تھا اور خود رعایا بھی اس کے انجام سے بے خبر نہ تھی۔ مہاراجہ کا ۱۸۳۹ء میں انتقال ہوا اور صرف دس سال کے بعد لارڈ ڈلہوزی نے مارچ ۱۸۴۹ء میں فیروز پور کیمپ سے سلطنت پنجاب کے الحاق کا فرمان جاری کیا۔ اور اس طرح چالیس سالہ پرانا تن آور درخت تھوڑے سے صدمے سے جڑ سے اکھڑ گیا۔ اس تباہی کو دس سال کا عرصہ کیوں کہا جائے۔ اس درخت کی جڑیں تو مہاراجہ کے آخری ایام میں ہی بوسیدہ نظر آنے لگیں تھیں اور اس کا گرنا اہلِ بصیرت کے نزدیک قطعی اور یقینی تھا۔ پنجاب کی اس ٹریجڈی کو معاصر اور مستند شہادتوں سے ابھی تک بیان نہیں کیا گیا۔ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا اگر مہاراجہ کے ہم عصر مورخین کے بیانات سے ان تاریخی حقائق کا بطور خلاصہ ذکر کیا جائے۔

سر لیپل گرفن نے لکھا ہے کہ رنجیت سنگھ پر ۱۸۳۴ء میں فالج کا پہلا حملہ ہوا[1]۔ لیکن مولوی احمد بخش یکدل نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے کہ "اس بیماری نے دو مہینے سے اوپر طول کھینچا

۱۔ رولرز آف انڈیا (اردو ترجمہ) ص ۶۲

اور مہاراجہ نے ۶ کاتک ۱۸۹۰ مطابق ۶ نومبر ۱۸۳۳ء کو دسہرے کے دن غسل صحت کیا۔"
بیدل نے مہاراجہ کی بیماری کا سب سے پہلے ذکر ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۴۹ھ مطابق ۲۸ اگست ۱۸۳۳ء
کے روزنامچے میں کیا ہے۔ اس اعتبار سے مہاراجہ کوئی ڈھائی مہینے کے قریب بیمار رہا۔
گرفن نے لکھا ہے کہ انگریز ڈاکٹر گریگر نے مہاراجہ کا علاج کیا لیکن اس سے کوئی افاقہ نہ ہوا
مولوی بیدل کے بیان کے مطابق فقیر عزیز الدین نے دوسرے درباری حکماء کے مشورے سے علاج کیا۔

مہاراجہ کی بیماری کا سیاسی ردِعمل پنجاب میں انگریزوں کی گھناؤنی سرگرمیوں کی
صورت میں رونما ہوا۔ جس کا نتیجہ، جمعدار خوشحال سنگھ کے ہاتھوں کشمیر کی تباہی، نونہال
سنگھ کی اپنے تاجدار باپ کھڑک سنگھ کی نافرمانی، سکھوں کی خانہ جنگی سے شروع ہو کر
سکھ سلطنت کے خاتمے تک تاریخ کے اوراق میں روشن اور واضح صورت میں موجود
ہے۔ اس جگہ مہاراجہ کی بیماری کا اجتماعی اور عوامی ردِعمل بیان کیا جاتا ہے تاکہ مابعد
کے عوامی طرزِ فکر اور اس سے پیدا ہونے والے ادبی ردّوں کا جائزہ لینا آسان ہو سکے۔
مولوی احمد بخش بیدل نے بھادوں ۱۸۹۰ب مطابق ۱۶ ربیع الاول ۱۲۴۹ھ بروز جمعہ اور
(اگست ۱۸۳۳ء) کو لکھا ہے:

"امروز از ضعف حکومت معائنہ شد کہ در شہر می رفتم و دیدم کہ یک سپاہی سکھ
براسپ سوار است و رواں دواں می آید۔ مردم ہراسیدند پیش قدبوس
اودھرہ، پنجہزار دینار بود کہ از مچھی ہٹہ از دوشِ حرافی دو گھڑی باقی ماندہ بردا شت
واسپ دوانید۔ وکسی باد نرسید، در چارسوی گھٹی نشستہ بودم۔ بالای چوکی
ہمراہ یکی گفتگو میکردم کہ ناگہاں آن سوار گذشت و بدیوار مسجد در خورد و صاف
اسپش صدمہ خوردہ افتاد۔ باز خیال کردم سوارش مردہ باشد*۔ دو ستارہ ہم نہ لبست
دو سہ آدم فراہم شد نہ کہ تیمارداری کنند چراکہ تا حال شخصی از نوعنائیان نرسیدہ بود

* آن لنگر صبح باز ایستادہ فقط اول بر اسپ سوار شد

گفت کہ ایں لقچہ را بدھید ۔ چوں مردم دست کردند، سخت گراں یافتند گفتند
کہ ایں دزد است وایں صرہ مبالغ است کہ زدہ آوردہ است ۔ آں سکھ
فی الفور اسپ راعناں گرفت و دوانید و صرہ را باز گذاشت ۔ دریں
اثنا مردم دواں دواں بسیار رسیدند و صرہ را دریافتند و خیلی فرحت اندوز
گشتند ۔ دریں اثنا خدابخش کوتوال رسید ہر چند تا بھائی دروازہ دوید سراغش
نیافت مردہ دم شد، —— مردماں بر ضعف سلطنت خیال کردند و
بسیاری تعجب رو داد۔"[2]

یہ ان بے شمار واقعات میں سے ایک ہے جسے بیکدل نے بیان کیا ہے ۔ رنجیت سنگھ کے آخری دور میں سکھ اخلاقی پستی کی انتہا تک پہنچ چکے تھے ۔ مذہبی تعصب جسے مہاراجہ کی انتظامی صلاحیت نے شدید نہیں ہونے دیا تھا اب زور پکڑ چکا تھا ۔ مہاراجہ اپنے بڑھاپے اور بیماری کے سبب اپنے اور حکومت کے اعصاب پر اپنی گرفت نہیں رکھتا تھا کہ تعصب کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکے ۔ مسلمان اس ظلم و تعدی کا خاص طور پر نشانہ بنے ۔ اس سلسلے میں مفتی غلام سرور لاہوری نے تاریخ مخزن پنجاب اور بیکدل نے اپنی بیاضوں میں متعدد واقعات بیان کئے ہیں ۔ مفتی غلام سرور کے بیان کردہ واقعات میں سنہری مسجد کی سکھوں کے ہاتھوں بے حرمتی اور مسلمانوں کی آہ و زاری پر اس کی واگذاری اور بیکدل کے نقل کئے ہوئے واقعات میں محرم کے جلوسوں پر پابندی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ بیکدل کا لکھا ہوا ایک واقعہ بے حد دلچسپ ہے لہذا نقل کیا جاتا ہے ۔

"روز محرم شریف ۱۲۵۰ھ یعنی دھم، رتن سنگھ کہ عدالت لاہور تعلق ابستجل

گفت کہ این لقچہ را بدھید ۔ چوں مردم دست کردند، سخت گراں یافتند گفتند

کہ این دزد است واین صرہ مبالغ است کہ زدہ آوردہ است ۔ آن سکھ

فی الفور اسپ راعنان گرفت و دوانید و صرہ را باز گذاشت ۔ دراین

اثنا مردم دوان دوان بسیار رسیدند و صرہ را دریافتند وخیلی فرحت اندوز

گشتند ۔ درین اثنا خدابخش کوتوال رسید ھر چند تا بھاٹی دروازہ دوید سراغش

نیافت مردہ دم شد، ـــــ مردمان بر ضعف سلطنت خیال کردند و

بسیاری تعجب رو داد ۔"[۲]

یہ ان بے شمار واقعات میں سے ایک ہے جسے یکدل نے بیان کیا ہے ۔ رنجیت سنگھ کے آخری دور میں سکھ اخلاقی پستی کی انتہا تک پہنچ چکے تھے ۔ مذہبی تعصب جسے مہاراجہ کی استغنائی صلاحیت نے شدید نہیں ہونے دیا تھا اب زور پکڑ چکا تھا ۔ مہاراجہ اپنے بڑھاپے اور بیماری کے سبب اپنے اور حکومت کے اعصاب پر اپنی گرفت نہیں رکھتا تھا کہ تعصب کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکے ۔ مسلمان اس ظلم وتعدی کا خاص طور پر نشانہ بنے ۔ اس سلسلے میں مفتی غلام سرور لاہوری نے تاریخ مخزن پنجاب اور یکدل نے اپنی بیاضوں میں متعدد واقعات بیان کیے ہیں ۔ مفتی غلام سرور کے بیان کردہ واقعات میں سنہری مسجد کی سکھوں کے ہاتھوں بے حرمتی اور مسلمانوں کی آہ و زاری پر اس کی واگذاری اور یکدل کے نقل کیے ہوئے واقعات میں محرم کے جلوسوں پر پابندی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ یکدل کا لکھا ہوا ایک واقعہ بے حد دلچسپ ہے لہٰذا نقل کیا جاتا ہے ۔

"روز محرم شریف ۱۲۵۰ھ یعنی دھم، رتن سنگھ کہ عدالت لاہور تعلق با ستمبل

۲۔ بیاض یکدل ۔ شمارہ ۲، ق ۱۶

مسلمانان سخت آزار رسانیده که سبیل ھای لاہور را تاراج نمودہ و مردم مسلمین را زدو کوب آنقدر شدہ کہ بعض را جان ھم رفتہ باشد ۔ و مصادرہ بسیار رفتہ و گامی شاہ نیز تعزیہ تیار کردہ بود مثل سابق او را گرفتار بردہ تعزیہ اندرون قلعہ طلبانند و او را آنچنان زدوکوب شدہ کہ خاطر او را مشوش ساختہ حق تعالیٰ امان بدھد ۔ مردم لاہور را شربت کہ تیار بود، سبوچہ ھا او خم ھا را شکستانیدند و سخت شورش در لاہور افتاد، روز دوم میح الدین قاضی ضامن شدہ ، والا نہ رنجیت سنگھ حکم دادہ بود کہ چون منادی کردہ بودم و حکم عدولی کردہ او را در خار و خسک انداختہ معہ تعزیہ بسوزانند[۴۳]

یہ صرف ایک مثال ہے ۔ سکھ رنجیت سنگھ کی مرضی کے خلاف اس کو فالج زدہ اور ذہنی طور پر کمزور سمجھ کر من مانیاں کرنے لگے تھے ۔ رنجیت سنگھ کے جائز وارثوں میں صرف ایک بیٹا تھا ۔ یعنی کھڑک سنگھ ۔ جو بالغ ہونے کے باوجود ذہن اور شخصیت سے نابالغ تھا اور ایک پوتا یعنی نونہال سنگھ جو گرم خون جلد باز اور تاریخی شواہد کے پیش نظر کوتاہ اندیش تھا ۔ رنجیت سنگھ نے سلطنت کے استحکام کے لیے جو عرق ریزی کی تھی اس کے پیش نظر وہ اسے اس قدر پائیدار سمجھتا تھا کہ اس کے ضائع ہو جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا ۔ لیکن ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کی وفات پر کھڑک سنگھ کی تخت نشینی سکھ سلطنت کے حق میں نیک شگون ثابت نہ ہوئی ۔ کھڑک سنگھ کے زمانے کی اہم تاریخی شہادتوں میں سے ایک فقیر عزیز الدین کا روزنامچہ ہے ۔ فقیر موصوف عہد رنجیت سنگھ اور بعد میں کھڑک سنگھ کے دربار میں وزیر امورِ خارجہ تھے ۔ اس روزنامچے میں دربار لاہور اور انگریزوں کے درمیان سیاسی

۴۳- بیاض کیدل ۔ شمارہ ۲ ، ف ۸۹

خط وکتابت موجود ہے۔ کھڑک سنگھ کی طرف سے جو خطوط انگریزوں کو لکھے گئے ہیں ان کا لہجہ دوستانہ سے زیادہ خوشامدانہ ہے۔ اور انگریزوں کے خطوط میں اس کے برعکس لہجے میں ذرا تحکم پایا جاتا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ کھڑک سنگھ اپنے آپ کو انگریزوں کے مقابلے کا نہیں سمجھتا تھا۔ حکومت کے ارکان اور وزراء کتنے ہی باہوش ہوں اگر حکمران خود ذہانت اور بصیرت سے عاری ہو تو مصاحبوں اور مشیروں کی عقل پر زیادہ دیر اعتماد ممکن نہیں ہوتا۔ فقیر عزیزالدین جیسے "خیرخواہان باصفا" اور بھی موجود تھے جنہیں مہاراجہ کے "مقبول" سری اکال پورکھ جی" کی حمایت حاصل تھی۔ لیکن انگریز اور دوسرے منافق دوست جو درپردہ حکومت پنجاب کے سیاسی تنزل کے منتظر تھے۔ مہاراجہ کھڑک سنگھ کی شخصیت اور حرکات کا بغور مطالعہ کر رہے تھے۔ انگریزوں کے علم میں تھا کہ کھڑک سنگھ جتنا بھی کمزور ہو، حکومت کو آسانی سے انگریزوں کے حوالے نہیں کرے گا۔ دوسری طرف انگریز شاہ شجاع کی حمایت کے پردے میں افغانستان پر حکومت کا خواب دیکھ رہے تھے اور اگر افغانستان میں ان کا منصوبہ کامیاب ہو جائے تو امرتسر سے پشاور تک کا علاقہ جس پر سکھ حکمران تھے۔ ان کی براہ راست نقل و حرکت میں رکاوٹ بنتا تھا۔ لہذا جلد یا بہ دیر انگریز کو اس قضیے کا فیصلہ بھی کرنا تھا۔ اس صورت حال میں کھڑک سنگھ جیسا بادشاہ جو انگریزوں کے پنجاب میں قبضے میں تاخیر کا باعث ہو انگریز حکومت کو کیسے پسند ہو سکتا تھا اس کے مقابلے میں کھڑک سنگھ کا بیٹا اور ولی عہد شہزادہ نونہال سنگھ پر جال ڈالنے کے امکانات زیادہ تھے۔ کیونکہ نونہال سنگھ بعض انگریزی افسروں کا نہ صرف دوست تھا بلکہ نہایت بے تکلفی سے ان کے ساتھ اکثر شکار وغیرہ پر بھی جایا کرتا تھا۔ اور تفریح اور عیش و عشرت میں ان کا ہم نوالہ اور ہم پیالہ تھا۔

نونہال سنگھ نے یقیناً انگریزوں کے ایما پر کھڑک سنگھ کو حکومت سے معزول کر دیا تھا۔ فقیر عزیزالدین کی ڈائری میں ایک ریزولیشن کی نقل موجود ہے جس کی رو سے عمائدین سلطنت

نے نونہال سنگھ سے وفاداری کا حلف اُٹھایا ہے[4]۔ اہلِ سیاست ہوا کا رُخ دیکھتے ہیں، انہوں نے نونہال سنگھ کے شخصی غرور کو تحفظ دیا لیکن کھڑک سنگھ کو بد دُعا دینے سے نہ روک سکے "کہ میرے بعد سلطنت اس کے نصیب میں نہ ہوگی"[5]۔ جس روز کھڑک سنگھ مرا، نونہال اپنے یورپین دوستوں کے ساتھ میاں میر کے قریب شکار کھیل رہا تھا۔ اس نے باپ کی موت کا واقعہ سُن کر قہقہہ لگایا لیکن دُوسرے دن جب کہ مہاراجہ کھڑک سنگھ کی ارتھی جلا کر واپس آرہے تھے اور نونہال سنگھ کی بادشاہت کا اعلان ہونے والا تھا قلعے کی دیوار سے ایک ٹکڑا ٹوٹ کر نونہال پر گرا اور نئے بادشاہ نے آناً فاناً دم توڑ دیا۔ نونہال سنگھ کی موت کے بعد حکومت اس کی ماں کو ملی، پھر راجہ شیر سنگھ تخت نشین ہوا اور آخر میں دلیپ سنگھ لیکن رانی چندر کور سے مہاراجہ دلیپ سنگھ تک پنجاب میں اقتدار کیلئے جو خون کی ہولی کھیلی گئی اس کے مفصل بیان کا یہ موقع نہیں۔ البتہ اس کے نتائج کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس خانہ جنگی سے نہ صرف پنجاب کی پُرشکوہ سلطنت متزلزل ہو گئی بلکہ مخالفین کو تباہ کن کاروائیاں کرنے کا موقع بھی ہاتھ آ گیا۔

سکھوں نے انگریزوں سے جان بوجھ کر معاہدے کی خلاف ورزی کی یا انہیں مجبور کیا گیا۔ اس کا فیصلہ مورخین کو کرنا چاہیئے۔ اس جگہ اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ سکھوں کیلئے معاہدے کی خلاف ورزی کے علاوہ دُوسرا کوئی راستہ ہی نہ تھا۔ ایک طرف رانی جنداں اپنے لئے اور اپنے قبیلے کے

۴۔ روز نامچہ فقیر عزیز الدین

۵۔ تاریخ مخزن پنجاب ص ۶۹۴

تاریخ لاہور ص ۲۲۴

تحقیقات چشتی ص ۱۷۰/ ۱۷۱

اقتدار کو محفوظ رکھنے کیلئے سکھ فوج کو غلط راستے پر ڈال رہی تھی اور دوسری طرف انگریز اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایسے حالات پیدا کر رہے تھے یا ایسے حالات کی سرپرستی کر رہے تھے جو سقوطِ پنجاب کے انگریزی خواب کو جلد از جلد حقیقت کا لباس پہنا سکیں۔ اس اجمال کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ لیکن مختصراً اس قدر کہنا ضروری ہے کہ امیران سندھ کی مہاراجہ سے بغاوت پر انگریزوں کا مہاراجہ کو لشکر کشی سے منع کرنا[۶]، اور جمعدار خوشحال سنگھ کے بقول کشمیر کی خرابی انگریزوں کے سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھی۔ بیکدل نے اپنی بیاضوں میں کشمیر کے بارے میں واضح طور پر لکھا ہے کہ:

"کہ دمہ از حرکت شنیعہ جمعدار خوشحال سنگھ کہ باغوای انگریزی و اندرون، اندرون ہمہ امرای سرکار، ملک را تاخت و تاراج کردند، ملک کشمیر ویران و بی چراغ مطلق گردیدہ و بی طلب حضور کشمیر را ویران کردہ روانہ این طرف شد[۷]۔"

الغرض جب رانی جنداں کے خاندان کا اقتدار خطرے میں پڑا تو اس نے ناعاقبت اندیش سکھوں کو انگریزوں کے خلاف بھڑکا کر پنجاب پر انگریزی قبضے کی راہ ہموار کر دی۔ سکھوں اور انگریزوں کے درمیان ۱۹ دسمبر ۱۸۴۵ء سے ۱۰ فروری ۱۸۴۶ء تک پانچ جنگیں ہوئیں۔ جن میں سکھوں کو بطور کامل شکست دیکر ۲۰ فروری ۱۸۴۶ء کو انگریز لاہور میں داخل ہوئے[۸]۔ بیکدل نے انگریزوں کے قلعہ لاہور میں داخلے کی تاریخ ۲۲ فروری ۱۸۴۶ء بتائی ہے۔ پوری عبارت یہ ہے:

۶۔ تحقیقاتِ چشتی ص ۱۶۳

۷۔ بیاض بیکدل شمارہ ۱ اکتوبر ۱۸۳۳ء

8- Lahore past and present. P. 217

"دہ پھاگن سمت ۱۹۰۲، انگریزاں داخل لاہور شدند و ۲۲ رفروری ۱۸۴۶ء
۱۲ رپھاگن سمت ۱۹۰۲، ۲۴ صفر المظفر ھجری روز شنبہ بہ میانمیر رسیدند
و روز سہ شنبہ داخل قلعہ لاہور شدند[9]۔"

اس بیان کے مطابق ڈاکٹر محمد باقر کی لکھی ہوئی ۲۰ رفروری کے بجائے انگریزوں کا لاہور میں ورود ۲۱ رفروری ۱۸۴۶ء قرار پاتا ہے۔ سید محمد لطیف[10] اور کنھیا لعل[11] کے بیانات البتہ ڈاکٹر محمد باقر کی تائید میں ہیں۔ لیکن چونکہ یکدل کا بیان ان سب سے اقدم ہے اور واقعات یکدل کے ذاتی مشاہدے سے تعلق رکھتے ہیں لہذا یکدل کی بتائی ہوئی تاریخ کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

۲۱ رفروری ۱۸۴۶ء سے ۲۹ رمارچ ۱۸۴۹ء تک انگریز مہاراجہ دلیپ سنگھ کے سرپرست اور حکومت پنجاب کے نام نہاد امین تھے یہ امانت داری کا ناٹک ۲۹ رمارچ ۱۸۴۹ء کو پنجاب کے ایسٹ انڈیا کمپنی میں الحاق کے ساتھ ختم ہو گیا[12]۔ اور لارڈ ڈلہوزی نے فیروزپور کیمپ سے پنجاب کی رعایا کے نام بطور اشتہار جو فرمان جاری کیا اس کا خلاصہ مفتی علی الدین کی کتاب عبرت نامہ اور ڈاکٹر محمد باقر کی انگریزی تصنیف تاریخ لاہور[13] میں موجود ہے۔ اس اشتہار کی مندرجہ ذیل عبارتیں قابل توجہ ہیں۔

۹۔ بیاض یکدل شمارہ ۱۰

10. History of the Punjab P. 551

۱۱۔ تاریخ پنجاب ص۔ ۴۴۲

12. Major Evans Bell, Annexation of the Punjab, London, Trubner and Co, Ludgate Hill. 1882. P. 3

13. Lahore Past and Present. P. 218-219.

". . . . نواب گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی بہادر ارشاد میکنند کہ اکنون صاحب سنگھاں از ملک پنجاب ختم شد۔ و تمامی ملک مہاراجہ دلیپ سنگھ داخل و شامل ملک ہندوستان گردید . . . د واضح باد کہ سرکار انگریزی با مذہب رعایای ملک پنجاب خواہ مسلمانان باشند، خواہ ہندو یا سکھ ہرگز علاقہ و سروکاری نخواہد داشت . . . . و گورنر جنرل بہادر بمردم رعایای پنجاب اطلاع میدہند کہ بلا حجت و تکرار اطاعت سرکار انگریزی را قبول کنند و کسانیکہ مطیع و منقاد سرکار مذکور خواہند مانند بر ایشان مہربانی و بملائمت حکمرانی خواہد شد۔"[۱۴]

اس اشتہار میں کئے گئے وعدہ کے ایفا کا پنجاب کی رعایا کو انتظار ہی رہا۔ اور اضافہ یہ کہ بجائے مذہبی رواداری اور انسان دوستی کے اہلِ پنجاب کو جن مختلف طریقوں سے ذلیل اور پریشان کیا گیا اس کی تفصیل معاصر اخبارات اور مورخین کے روزنامچوں میں موجود ہے۔ اس جگہ یہ اشارہ بے محل نہ ہوگا کہ مہاراجہ دلیپ سنگھ کو جب انگریزوں نے معزول کر کے ملک بدر کیا تو اس حقیقت کے باوجود کہ سکھ حکومت مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو ہمیشہ اہمیت دیتی اور قابلِ احترام سمجھتی تھی ـــ مسلمانوں نے دلیپ سنگھ کے جانے پر سوگ منایا اور ہندوؤں نے انگریزی حکومت کا خیر مقدم کیا۔ نمک حلالی کی اس سے بہتر مثال شاید اور نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلے میں مفتی غلام سرور لاہوری کا اظہار تاسف اور امرناتھ اکبری کا خیر مقدم قابلِ ذکر ہے۔ مفتی غلام سرور کے بعض اشعار درج ذیل ہیں۔

چوں شہ پنجاب از پنجاب رفت — چشم سان از چشم مردم آب رفت
عالمی در چشم مردم شد سیاہ — چوں ز چشم آں غیرت مہتاب رفت
جملہ گل در ہجر او خوردند گل — بلکہ از نرگس خمار خواب رفت

۱۴۔ عبرت نامہ جلد اول ص ۵۹۲

بُلبلاں در فرقتش نعرہ زدند   چو زلستاں صحبت احباب رفت
گفت مسرور از سر درد ایں سخن   نو گلے از گلشن پنجاب رفت[15]
۱۳۶۶ء

امرناتھ نے انگریزوں کی فتح پنجاب پر مبارک نامہ لکھا۔ سر جان لارنس کے لفٹیننٹ گورنر ہونے پر منظومہ تبریک لکھا۔ انگریزوں کے ہاتھوں فتح لکھنؤ کی تاریخ کہی[16] وغیرہ۔ امرناتھ اکبری کا خاندان سکھوں کا پروردہ تھا۔ خود امرناتھ اکبری پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی عنایات تاریخ سے چھپی ہوئی نہیں ہیں۔ مُفتی اور اکبری کا مقابلہ ایک جملہ میں یُوں کیا جا سکتا ہے کہ اکبری اس دور کی سیاسی اور مفتی اس دور کی عوامی صدا ہے۔

لاھور میں انگریزوں کے ورود کا سماجی، سیاسی، اقتصادی اور عوامی ردِ عمل نہایت دلچسپ ہے لیکن اس کا بیان آئندہ باب کے لئے مخصوص ہے۔ اس جگہ انیسویں صدی کے نصف اوّل کے پنجاب میں اردو ادب کی صورتِ حال پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔

سکھ دَور میں ادیبوں اور شاعروں کی درباری سرپرستی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کے باوجود اس دَور میں ممتاز شخصیتیں بعنوانِ شاعر اور ادیب نظر آتی ہیں۔ انیسویں صدی کا نصف اوّل چونکہ ہمارا اصلی موضوع نہیں لہٰذا ان ادبی کاموں کا جائزہ بطور مختصر پیش کیا جائے گا جو اس دَور میں پنجاب کے مختلف حصّوں میں انجام ہوئے۔ یہ جائزہ ہماری آئندہ توضیحات اور تفصیلات کے لئے پسِ منظر کی حیثیت رکھتا ہے۔

سکھ دَور میں پنجاب کے ہر گوشہ میں شاعری کے مراکز موجود تھے۔ ھر چند جیسا کہ پہلے

۱۵۔ گنجِ تاریخ۔ ص ۲۱۰

۱۶۔ زیرِ نظر مقالہ میں امرناتھ اکبری کے آٹوگراف سے استفادہ کیا گیا ہے۔ دیوان اکبری ۱۸۷۳ء میں مطبع کوہ نور لاھور سے شائع ہُوا تھا جو اکبری کے اپنے مسودے کے مُطابق نہیں۔

عرض کیا گیا ہے دربار کی طرف سے کسی قسم کی تشویق یا سرپرستی کی کوئی مثال نظر نہیں آتی ــــ
شاعروں اور ادیبوں کو دو نمایاں گروہوں میں دیکھا جا سکتا ہے ۔ عوام اور خواص ۔ عوام میں وہ
صدہا موزوں طبع اور شاعر موجود ہیں جن میں سے بعض کا اپنے شغل اور پیشوں کے اعتبار
سے ادب سے دور کا تعلق نہیں ہے ۔ لیکن وہ نہ صرف بلند پایہ ادبی ذوق کے مالک
ہیں بلکہ قابلِ توجہ شاعر بھی ہیں ۔

بطور مثال تین نام پیشِ خدمت ہیں ۔

۱ ۔ میاں ولی محمد حجامؔ : بیکدل نے ان کا دو جگہ ذکر کیا ہے ۔ بیاض نمبر ۵
میں لکھتا ہے کہ میاں ولی محمد، بیکدل کے مکتب میں آئے اور چند اشعار سنائے جنہیں بیکدل
نے بطور یادگار یادداشت کر لیا ان میں سے ایک شعر درج ذیل ہے ۔

جی میں آتا ہے کہ اب چاک گریباں کیجیے
شہر کو چھوڑ، بیاباں کا رستہ لیجیے[۱۷]

دوسرے موقعے پر میاں ولی محمد دیوان بھوانی داس پشاوری کو حجامت بناتے ہوئے چند رہبان برہمن کا
یہ شعر سناتا ہے ۔

زنارِ ما کہ بر کتف خود نہادہ ام
ہستم سگِ رسول، رسن در گلوے من

سردار بھوانی داس کہتا ہے : "میاں ولی محمد برای شما منبر بود تا وعظ کنند"[۱۸] ۔

۲ ۔ علمی لوہار : بیکدل نے بیاض نمبر ۵ میں علمی کے چند پنجابی اور ایک اردو شعر

---

۱۷ ۔ بیاض بیکدل ۔ شمارہ ۵ ۔ ف ۱۲۳ ۔
۱۸ ۔ ایضاً ۔ شمارہ ۱۳ ۔ ف ۱۸ ۔

درج کیا ہے۔ مولوی ممتاز علی چشتی نے بیاض کو نقل کرتے ہوئے اردو شعر کا پہلا مصرعہ خراب کر دیا ہے۔

میں نے پورا شعر یوں پڑھا ہے:

سیپہ کے فرزند تجھے ہے لازم برس تو بیس لکھ اس کو رکھنا
اگرچہ سندر پری ہو اس کو پلک اٹھا کر کبھی نہ تکنا[19]

یکدل نے علمی کے بارے میں یہ اطلاع بھی دی ہے کہ وہ موچی دروازے کا رہنے والا ہے۔

۳ ۔ فیض اللہ کوفتگر ۔ بیاض یکدل میں جا بجا ان کا ذکر موجود ہے۔ اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے، اور تاریخ گوئی میں بطور خاص دسترس رکھتے تھے۔ مولوی غلام حسین چشتی کی تاریخ وفات اردو مصرعوں میں نکالی ہے۔

ع ہے ولی غلام حسین اور ع وہ محب غلام حسین

یکدل نے لکھا ہے کہ فیض اللہ کوفتگر نے مہاراجہ شیر سنگھ کی تخت نشینی پر درج ذیل تاریخ جلوس کہی۔

"والی ملک با ورنگ شہنشاہ نشست"
"و آن را دو صد روپیہ و یک جھلار[20] یکصد روپیہ مہاراجہ دادہ بود"[21]

اسی طرح کوفتگر نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات ان دو مصرعوں سے نکالی جو شاعر کی علمی اور ادبی استعداد کی گواہی دیتے ہیں۔

---

۱۹ ۔ بیاض یکدل ۔ شمارہ ۵، ف ۱۳۳۔

۲۰ ۔ جھلار: جوہڑ کے اوپر چاہ نما وسیلۂ آبپاشی

۲۱ ۔ بیاض یکدل ۔ شمارہ ۷ ف ۹۲

سیہ گردید خورشید جہانتاب - چشم خورشید آمدہ زیر کسوف[22]

یکدل نے کوفتگر کے ایک بیٹے کا نام ضیاء اللہ لکھا ہے - اس کے بارے میں تفصیلات مہیا نہ ہو سکیں[23] -

دوسرا گروہ خواص کا تھا - یعنی وہ شعراء یا ادباء جن کو خاندانی یا علمی شہرت حاصل تھی اور جن کی تحریریں محفوظ کی جاتی تھیں - سکھوں کی قلمرو کے چند اہم مرکز میں ایسے علمی گھرانے موجود تھے جو کسی نہ کسی صورت میں شعر و ادب کی خدمت کر رہے تھے - اہم شہروں میں امرتسر، لاہور، بٹالہ، پشاور اور کشمیر کے نام لئے جا سکتے ہیں - لاہور اور امرتسر تو ادیبوں کے مرکز تھے - بٹالہ میں غلام قادر شاہ بٹالوی مصنف رموز العشق (متوفی ۱۱۷۶ھ) کے مریدین اور اخلاف دینی اور روحانی ادب کی اس شمع کو برابر روشن کئے ہوئے تھے جسے حضرت محمد فاضل بٹالوی اور ان کے صاحبزادے غلام قادر شاہ بٹالوی نے جلایا تھا - قاضی فضل حق نے اس سلسلے کو بٹالہ سکول[24] کا نام دیا ہے - پشاور میں استاد تقی پشاوری خطاط اور شاعر دونوں کی حیثیت سے علم و ادب کی خدمت کر رہے تھے - ان کا ذکر یکدل نے بھی اپنے روز ناموں میں کیا ہے - تقی پشاوری کے اشعار اردو شاعری کا قابل توجہ نمونہ ہیں -

لاہور اور امرتسر کے ادبی ماحول کو ادبی گروہوں میں خاندانوں کے اعتبار سے

---

۲۲ - بیاض یکدل شمارہ ۵ ف ۱۸۰

۲۳ - ایضاً شمارہ ۸ ف ۳۸

۲۴ - پنجاب میں اردو، ضمیمہ نمبر ۱، مرتب ڈاکٹر وحید قریشی ص ۳۸۳ -

تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان خاندانوں میں قریشیوں کا خاندان جن کے معروف ترین فرد مفتی غلام سرور لاہوری تھے۔ فقیروں کا خاندان جن کے دو شاعروں نے اس دور کے ادبی ماحول کو متاثر کیا، یعنی فقیر عزیز الدین آزاد جو رضا بھی تخلص کرتے تھے۔ اور فقیر نورالدین منور۔ دونوں حضرات کے کلیات شعر موجود ہیں۔[۲۵]

پیروں کا خاندان۔ جن کا مفصل ذکر پیر غلام دستگیر نامی کی قابلِ قدر تالیف تاریخ جلیلہ میں موجود ہے۔ چشتی خاندان جن کی ادبی روایت مولوی ضیاء الحق چشتی اور مولوی محمد ابراہیم چشتی سے شروع ہوتی ہے۔ انیسویں صدی کے نصف اوّل میں مولوی احمد بخش یکدل اور ان کے دو فرزند مولوی نور احمد چشتی اور مولوی محمد علی پُردل چشتی اردو ادب کی قابلِ قدر خدمات انجام دے رہے تھے۔ اہلِ ہنود میں سے دیوانوں کا خاندان قابلِ ذکر ہے۔ رنجیت سنگھ کے وزیرِ خزانہ دیوان دینا ناتھ مدان جو سوز تخلص کرتے تھے نہ صرف شاعر تھے بلکہ کسی حد تک شاعروں کے قدردان بھی تھے۔ ان کے بیٹے دیوان امرناتھ اکبری نے نہ صرف مورخ ہونے کی حیثیت سے شہرت حاصل کی بلکہ دیوانِ اکبری میں ان کا اردو اور فارسی کلام ان کے عمدہ شاعر ہونے کا واضح ثبوت ہے۔

پنجاب کے بعض دوسرے مراکز میں بھی اردو کے اہم شاعر موجود تھے مثلاً مرالہ (گجرات) میں احمد یار مرالوی، گوجرانوالہ میں اشرف فاروقی منچری جن کا ذکر قاضی فضل حق مرحوم نے اپنے مقالات میں اشرف نوشاہی کے نام سے کیا ہے۔ وڈالہ سندھواں (سیالکوٹ) میں عبدالرحمان خلدی وغیرہ۔ ان شعراء کے حالات اور کلام حافظ محمود شیرانی کی پنجاب میں اردو اور قاضی فضل حق کے مقالات میں موجود ہے۔ ان میں سے بعض کا ذکر پہلے باب میں کیا جا چکا ہے۔

۲۵۔ فقیر نور الدین کا نامکمل کلام۔ "دیوان منور" کے نام سے پیکجز لاہور نے شائع کیا ہے۔

(۲)

پنجاب میں انگریزوں کے ورود کا سماجی، سیاسی، اقتصادی اور عوامی ردِ عمل نہایت دلچسپ اور تاریخی پس منظر میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ لاہور (پائیتخت پنجاب) اور ھندوستان (جو اس وقت تک پنجاب سے الگ ملک مانا جاتا تھا) میں لکھے گئے روزنامچے تاریخیں اور اخبارات کہیں کہیں اس ردِ عمل کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ اس جگہ سب سے پہلے مولوی احمد بخش یکدل کے روزنامچے کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ ھندوستان کی عمومی تاریخ پر یادداشت کے آخر میں لکھتے ہیں:

"من در عہدِ انگریزی تنہا شدم، وھمہ مردم مشغول ہوا ہوس شدند۔"[۲۶]

معاصر اخباروں سے چند ایک اقتباس بطور نمونہ کافی ہوں گے: کوہِ نور لاہور انگریزوں کی آمد کے فوراً بعد گورنمنٹ کا ہم آواز ہو گیا تھا، اس کے باوجود لالہ ھرسکھ رائے مُدیر کوہِ نور کا مشرقی ضمیر اسے حق گوئی سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ انگریزوں کی انتظامی پالیسی پنجاب میں امن و امان کی جو برکات لیکر آئی، ان کا مفصل بیان بعد میں آئیگا پہلے اس صورتِ حال کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے جو حاکم اور محکوم کے بنیادی فلسفے سے پنجاب میں پیدا ہوئی۔ انگریز سیاست دان، حکمران اور سفید پوست "گورے" اپنے آپ کو شروع ہی سے حاکم سمجھنے لگے تھے اور پنجاب کو مالِ غنیمت سمجھ کر لوٹنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ اہم خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ آغاز میں ملکی نظم و نسق میں غنڈوں کا بھی دخل تھا۔ شاید انھیں حکمران اپنے مددگار سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں کوہِ نور اور آفتاب ھند بنارس کی چند خبریں ملاحظہ فرمائیے۔ یہ سب لاہور سے متعلق ہیں۔

۲۶۔ اوراق منسلکہ گلستان سعدی بخط یکدل، نیشنل میوزیم کراچی۔

"محلہ بھاٹی دروازہ میں ایک گورہ نے متصل خانہ بھائی رام سنگھ ایک بھلے مانس کے گھر میں جاکر ایک عورت جمیلہ کو دبا لیا تھا۔ ایک مرد نے اور عورتوں کا شور سُن کر اندر جاکر گورہ سے عورت کو چھڑایا۔ مگر آپسمیں مارپیٹ سخت ہوئی اور آخر کار گورہ بھاگ گیا[۲۷]"۔

"شہر کے بھنگیوں کو تاکیداً حکم ہو گیا ہے کہ ہر ایک محلہ کی خبر بلا تامل تھانہ جات میں پہنچا دیں[۲۸]"۔

اسی سال مارچ میں اس قسم کا ایک واقعہ امرتسر میں بھی رونما ہوتا ہے جس کی اطلاع کوہِ نور نے ۲۴ ر جون ۱۸۵۱ کی اشاعت میں اس طرح دی ہے:

"ہفتۂ گزشتہ ہم نے دیکھا کہ ایک گورہ نے جیون سنگھ کمیدان پلٹن سورج مکھی کو جو بباعث خیر خواہیوں اور بہادریوں کے نہایت نیک نام تھا ضرب شمشیر آبدار سے قتل کیا"۔

اخبار آفتاب ھند بنارس کی ۱۷ ر مارچ ۱۸۵۳ کی اشاعت سے اندازہ ہوتا ہے کہ گورہ غاتگری اور غنڈہ گردی کا دور ابھی ختم نہیں ہوا۔ چنانچہ خبر لاہور کے تحت درج ہے کہ:

"تاریخ چھ مارچ کو . . . . . گوروں نے بہ حالت نشہ . . . آکر بڑا فتور مچایا اور بہت سے آدمی دکانداروں کو زدوکوب کیا۔ جب نہایت شور و غل ہوا . . . تھانہ و تحصیل تک اطلاع . . . اور برق اندازان تحصیل و چوکی داران بہ نظر حفاظت جو اس جگہ پر آئے تو ان بدمستوں کو زیادہ تر جوش آیا بلکہ

۲۷۔ منشی ہرسکھ رائے - کوہِ نور، ۱۱ ر فروری ۱۸۵۱

۲۸۔ ایضاً

ایک چراسی تحصیل کو پہلے تو خوب مارا، بعدہٗ ایک بوتل شراب اس کے سر پر
ماری کہ خون جاری ہو گیا۔"[29]

کہ نور وغیرہ کی خبروں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شہر کے دروازوں پر غنڈے کھڑے ہوتے تھے جو راہ چلتی ہوئی شریف زادیوں کو چھیڑتے تھے یہ صورتِ حال ہندو اور مسلمان دونوں کیلئے برابر تھی۔ نور احمد چشتی نے بھی ان کا ذکر درج ذیل الفاظ سے کیا ہے:

"ان دنوں شہر لاہور اور امرتسر میں ایک قسم کے لچّے برآمد ہوئے ہیں۔ عقل حیران ہے کہ ان لوگوں نے کیا راہ و رسم نکالی ہے۔ یعنی سُرخ پگڑیں (پگڑیاں) باندھتے اور پنڑیوں (پنڈلیوں) کے بال منڈاتے اور بٹیرے رکھتے ہیں۔ اور آپسمیں ان کا یہ اقرار ہوتا ہے کہ آپسمیں گو کیتنی لڑائی ہو، ایک دوسرے پر کوئی نالش نہ کرے۔ اور لڑائی کے واسطے چھوٹے چھوٹے ڈنڈے رنگین بنا کے لغبلوں میں رکھتے ہیں۔ اور جب لڑائی کرتے ہیں تو خوب لڑتے ہیں سرکار کو ان کا بندوبست ضروریات سے ہے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ اکثر یہ لوگ چوری چکاری بھی کرتے ہوں گے اور بھلے مانسوں کی بہو بیٹیوں کو بھی ورغلاتے ہیں۔ غرض گنڈا (غنڈہ) لچّے کو کہتے ہیں۔"[30]

مارچ ۱۸۴۹ء کو اہلِ پنجاب اپنی حکومت سے محروم ہوئے۔ یہ احساسِ محرومی ایک دوسرے سانحے کے سبب اور زیادہ شدید ہو گیا کہ دربار لاہور کے اثاث البیت کا بر سرِ عام نیلام منعقد کیا گیا۔ اس جگہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دربار لاہور نصف صدی تک

۲۹۔ محمد عتیق صدیقی، صوبہ شمالی اور مغربی کے اخبارات و مطبوعات، علی گڑھ، انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۲ء، ص ۲۹۲

۳۰۔ یادگار چشتی، نور احمد چشتی، لاہور، مجلس ترقی ادب، مرتب گوہر نوشاہی، ۱۹۷۵ء، ص ۱۶۰۔

اہلِ پنجاب کی تمدنی اور فکری زندگی کے لئے علامتی حیثیت رکھتے ہوئے تھا۔ دربار کے بیشتر لوازم مسلمان اور ہندو ریاستوں کی خاندانی یادگاریں تھیں۔ ان تمدنی آثار کا برسرِعام نیلام وطنی احساسات کی توہین سمجھا گیا۔ کوہِ نور کی بعض خبریں بین السطور میں ہلکی ہلکی صدائے احتجاج لئے ہوئے ہیں۔ شاید اس نیلام کا ایک مقصد فاتح قوم کے گھروں میں پنجاب کے نوادر کی اندھا دھند جمع آوری ہو۔ یا شاید پنجاب کو اپنے تاریخی مآخذ سے محروم کرنا۔ بہرحال تیسرے نیلام کی خبر کوہِ نور لاہور نے ۴ مارچ ۱۸۵۰ کی اشاعت میں یوں درج کی ہے:

"۲۵ مارچ کو تیسرا نیلام باہتمام صاحب موصوف پھر شروع ہوگا۔ دوشالہ، رومال، ہر قسم کا پشمینہ، نہایت عمدہ اور بہتر ساخت خاص کشمیر وغیرہ اور پارچہ ابریشمی ملتانی و کشمیری نہایت عمدہ اور پوشاک پنجابی ہر قسم کی"۔

مصیبت زنجیریں بن کر آتی ہے۔ اکتوبر ۱۸۵۰ سے نومبر ۱۸۵۰ تک اہلِ پنجاب تپ لرزہ میں گرفتار ہوئے۔ جس سے سینکڑوں آدمی جاں بحق ہوئے۔ عمومی سطح پر طبی امداد کا خبروں میں کوئی ذکر نہیں۔ بعض خبریں درج ذیل ہیں۔

"بیماری تپ لرزہ تمام پنجاب میں آج کل بر جھوں سے بڑھ کر زور پر ہے"۔ (کوہِ نور ۱۵ اکتوبر ۱۸۵۰ء)

"بیماری کی ایسی زور ہے کہ ہر ایک رجمنٹ میں دو دو سو اور تین تین سو جوان اسپتال میں ہیں"۔ (کوہِ نور۔ ۲۱ر اکتوبر ۱۸۵۰ء)

"لاہور میں بیماری بدستور ہے۔ مسافران ملک بقا کے جو گرم رَو تھے ہنوز بدستور ہیں۔ خدا اپنا فضل کرے اور اپنے بندوں کو پناہ میں رکھے"۔ (ایضاً ۱۱ر نومبر ۱۸۵۰ء)

"بیماری بدستور ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ" (ایضاً ۱۵ر نومبر ۱۸۵۰ء)

"بیماری کو گونہ تخفیف ہے" (ایضاً ۲۰ر نومبر ۱۸۵۰ء)

سید محمد لطیف نے انگریزوں کی فتح کو پنجاب میں امن اور تہذیب کی فتح لکھا ہے۔

"But the most important by far of the victories achieved by the British in the Punjab were victories of peace and civilization."[31]

اس جملے کا مفہوم معاصر خبر نگاروں اور وقائع نویسوں کی یادداشتوں کے پیشِ نظر صحیح ہیں ہے۔ الحاق پنجاب کو اس عہد میں انگریزوں کی استعمار گرانہ خارجہ پالیسی کا حصہ سمجھنا چاہیے۔ البتہ پچھلے دس سالوں میں پنجاب جس قتل و غارت اور آشوب زیست کا شکار ہو رہا تھا، اس میں کمی آ گئی۔

مارچ ۱۸۴۹ء میں پنجاب کے نظم و نسق کے لئے انتظامی بورڈ قائم کیا گیا۔ جس کے چیئرمین کرنل (بعد ازاں) سر ہنری لارنس تھے۔ ابتداء میں جو اصلاحات نافذ کی گئیں، ان کا تعلق عام طور پر انتظامی امور سے تھا۔ امن عامہ کے لئے کچھ قوانین بنائے گئے۔ مثلاً عوام، پولیس اور افراد سے اسلحہ چھین لیا گیا۔ ملٹری پولیس اور سول پولیس کی الگ الگ از سرِ نو تنظیم کی گئی۔ پنجاب فرنٹیر فورس کے لئے آئین مرتب کیا گیا۔ وغیرہ

"فروری ۱۸۵۳ میں انتظامی بورڈ ختم کر دیا گیا اور سر جان لارنس کو چیف کمشنر کا عہدہ دیکر حاکم پنجاب مقرر کیا گیا۔ ان کے بعد سر ڈونلڈ میکلوڈ اس عہدے پر فائز ہوئے پنجاب کے ادیبوں نے ان کی عوام دوستی اور حکمت عملی کی تعریف کی ہے۔"[۳۲]

اس زمانے میں دوسرے امور کے علاوہ اہل پنجاب کی تعلیمی ترقی کے بارے میں بھی توجہ عمل میں آئی

31- History of the Punjab P. 574

۳۲۔ نور احمد چشتی، مقدمہ عجائبات چشتی، لاہور، ۱۸۶۰

امرتسر میں مشنری سکول کا قیام اِس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ تحقیقاتِ چشتی کے مصنف نور احمد چشتی اسی مدرسے میں فارسی اور اردو کے مدرس مقرّر ہو کر لاہور سے امرتسر گئے تھے۔ ۱۸۵۳ کے بعد اگر لارڈ میکالے کی کوششوں کے زیرِ اثر انگریزوں نے اردو کے بجائے انگریزی کو سرکاری زبان بنا لیا تھا۔ چنانچہ امرتسر کے مشنری سکول میں اردو ہی ذریعہ تعلیم تھی۔ سید نوراللہ اور جے پی نارنگ نے اس واحد سرکاری ادارے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس میں اردو (ھندی) فارسی، عربی، سنسکرت اور گورمکھی کے شعبے تھے۔"[۳۳] اردو اور ملکی زبانوں سے اہلِ پنجاب کا یہ قلبی اور فکری تعلق ربع صدی کے بعد یونیورسٹی کے قیام کی صورت میں نمایاں ہوا اس کا مفصل ذکر آئندہ باب میں ہو گا۔

سکھ دور میں چونکہ مسلمان ہمیشہ بے اعتنائی اور سرد مہری کا شکار ہوتے رہے تھے لہٰذا تالیفِ قلوب کے لیے انگریزوں نے مسلمانوں کی کسی حد تک حوصلہ افزائی کی کوشش کی۔ ہمیں سید محمد لطیف اور دوسرے مورخین کی رائے سے اتفاق نہیں کہ آغاز سے ہی انگریزوں کی مذہبی پالیسی غیر جانبدار تھی۔ یہ حکمتِ عملی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد دفتری اور کاغذی طور پر اختیار کی گئی۔ شروع ہی سے پادریوں کا اثر و رسوخ شروع ہو گیا تھا۔ اور ان کی متعصبانہ مذہبی تبلیغ کو حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی۔

ایک اہم بات جو پنجاب میں انگریزی حکومت کے ساتھ ہی شروع ہوئی وہ پنجاب کی تاریخی اہمیت تھی۔ پنجاب کے بارے میں معلومات کی فراہمی بہتر حکمرانی کی قابلِ توجہ ضرورت تھی۔ جن ادیبوں اور محققوں کو سکھ دور سے تاریخ نویسی کا شوق پڑا ہوا تھا انھوں نے اس سلسلے میں تازہ حکمرانوں کی مدد کی۔ انگریزوں نے تاریخ دانوں اور تاریخی مواد

۳۳۔ سید نوراللہ اور جے پی نارنگ، تاریخ تعلیم ھند، نیشنل بک ٹرسٹ، ۱۹۷۳، ص ۱۲۵

فراہم کرنے والوں کی اِس قدر حوصلہ افزائی اور تعظیم کی کہ بیکل جیسے انگریز دشمن مؤرخ بھی ان کی قدردانی کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں[۳۴]۔ انگریزوں نے اہلِ پنجاب کا رجحان دیکھ کر یک لخت انگریزی کو مسلط کرنا مناسب نہ سمجھا، لہٰذا تعلیمی اور ملکی سطح پر نہ صرف اردو زبان کا سکہ جاری رہا بلکہ خود انگریز افسروں نے اُردو زبان کی تعلیم بطورِ خصوصی حاصل کی۔ تحقیقاتِ چشتی کے مصنف مولوی نُور احمد چشتی نے اپنے یورپین شاگردوں کی تعداد دو ہزار کے قریب بیان کی ہے[۳۵]۔

پنجاب کا نیا نظم و نسق ابھی ابتدائی مراحل میں ہی تھا اور پنجاب کی رعایا اور نئے حاکموں کے درمیان افہام و تفہیم کا سلسلہ شروع ہی ہُوا تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا واقعہ رونما ہو گیا۔ اس واقعے نے از سرِ نو حاکم اور محکوم کے درمیان بے اعتمادی اور شک و شبہ کی دیوار کھڑی کر دی۔ پنجاب اس واقعے سے چھ سال پہلے انگریزوں کے انتظام میں براہِ راست آ چکا تھا اور انگریزی حکومت کا ایک صُوبہ سمجھا جاتا تھا، لہٰذا آزادی خواہوں کے سدِّ باب کے لئے خاص اقدام کئے گئے۔ اِن واقعات کی تفصیل آئندہ باب میں آئے گی۔ ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۷ء تک کے ادب کو چند اہم موضوعات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ شاعری، ادبی نثر اور صحافت ان موضوعات کو ذرا سی تفصیل کے ساتھ یُوں زیرِ بحث لایا جا سکتا ہے۔

شاعری: رنجیت سنگھ اور سکھ عہد کے بزرگ شعراء میں سے اکثر مثلاً مولوی احمد بخش یکدل، مولوی فرید الدین فرید، فیض بخش فیض، مولوی غلام حسین خرم وغیرہ ابھی زندہ تھے اور ان کے ساتھ ہی سکھ دور کے نوجوان شعراء جو غالباً ان بزرگوں کے خوانِ فیض کے پروردہ تھے شاعری کے چراغ روشن کئے ہُوئے تھے۔ ان میں سے بعض شاعری اور نثر دونوں میں شہرت رکھتے

۳۴۔ بیاضِ یکدل شمارہ ۱۳، ص ۱۲۔

۳۵۔ تحقیقاتِ چشتی۔ ص ۲۷، تفصیل کے لئے دیکھئے مقدمہ یادگارِ چشتی، مرتب گوہر نوشاہی۔

تھے ۔ قابلِ ذکر شعراء میں دیوان امرناتھ اکبری، مولوی نُور احمد چشتی، مولوی محمد علی پردل چشتی مُفتی غلام سرور لاہوری، مولوی غلام فرید کے فرزند مولوی پارس علی اور مسٹر رام داس قابل وغیرہ قابلِ ذکر ہیں ۔ ان میں سے اکثر شعراء پنجاب کے دارالسلطنت لاہور میں ہی قیام پذیر تھے ۔ ان شعراء کا الگ الگ تعارف پیش کیا جاتا ہے ۔

دیوان امرناتھ اکبری :

امرناتھ اکبری کے بزرگ کشمیر کے رہنے والے تھے ۔ جہاں انھیں شاہجہاں کے عہد میں مناصب جلیلہ حاصل ہوئے تھے ۔ امرناتھ کے اجداد میں سے ایک شخص جس کا نام لاچی رام تھا کشمیر کو ترک کر کے لاہور آ گیا اور اس صوبے کے حاکم سے مُلازمت حاصل کی ۔ لیکن حکمران لاہور کے عہدے سے برخاست ہونے کے ساتھ ہی مُلازمت سے محروم ہو کر دہلی چلا گیا اور باقی عُمر وہاں بسر کی ۔

امرناتھ کا دادا بخت مل ذہین اور خوش نصیب آدمی تھا ۔ عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر اچھا عبور ہونے کے سبب سے حکومت کے محکمۂ مالیات میں مُلازمت حاصل کرنے میں اسے دقّت نہ ہُوئی ۔ چنانچہ اپنی غیر معمولی قابلیت اور محنت کی وجہ سے اُس نے جلد ہی اپنے افسروں کے دلوں میں اپنا مقام پیدا کر لیا ۔

۱۸۰۳ء میں جب لارڈ لیک نے دہلی کو فتح کیا ۔ بخت مل انگریزی مُلازمت میں آ گیا ۔ اسی سال جب لارڈ لیک نے پنجاب کا دورہ کیا تو راجہ بخت مل جو اس زمانے میں سر جان میلکم کے ذاتی سٹاف میں تھا، اپنے آفیسر کے ہمراہ امرتسر آیا ۔ ادبی سوجھ بوجھ اور معاشرتی دید رکھنے کے سبب اس نے ماحول کا اس طرح مطالعہ کیا کہ اس قیام کے دوران میں اس نے سکھوں کی تاریخ لکھنے کے لئے پوری کتاب کے لئے مواد جمع کر لیا جسے بعد میں کتابی صُورت بھی دی ۔ اکبری نے اس کام کی طرف ظفرنامہ رنجیت سنگھ میں بعض جگہوں پر

اشارے کیئے ہیں۔

بخت مل کے بڑے بیٹے دینا ناتھ کو دربار لاہور کے رئیس دفتر دیوان گنگا رام نے ۱۸۱۵ء میں پنجاب میں آنے کی دعوت دی۔ یہاں اسے ایسی ملازمت دی گئی جس میں اسے اپنے جوہر ذاتی کو بروئے کار لانے کا موقع ملا۔ اس کے عہدوں میں روز بروز ترقی ہوتی گئی تا آنکہ ۱۸۲۳ء میں دیوان بھوانی داس کی موت کے بعد اسے محکمۂ مالیات کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔ دربار لاہور میں دیوان دینا ناتھ کی اہمیت یہاں تک تھی کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ اکثر امور میں اس سے مشورہ لیا کرتا تھا۔

امرناتھ اکبری سمت ۱۸۸۹ء (مطابق ۲۳-۱۸۲۲) میں پیدا ہوا۔ ابھی صرف ایک سال کا تھا کہ ماں کا انتقال ہو گیا اور اسے دایہ کی گود میں دے دیا گیا۔ راجہ دینا ناتھ نے دوسری شادی کی اور امرناتھ ایک ذہنی اور فکری انقباض میں اپنا بچپن گزارنے لگا۔ ۲۹-۱۸۲۸ء میں جب وہ چھ سال کا تھا اسے اپنے عہد کے ممتاز دانشور مولوی احمد بخش یکدل کے مکتب میں بٹھایا گیا۔ مولوی یکدل کی ڈائریوں میں جا بجا امرناتھ کی ذہانت کا ذکر موجود ہے۔ امرناتھ بچپن سے ہی علم و ادب کا دلدادہ تھا اور ہوش و ذکاوت کا مالک۔ اس نے گیارہ سال کی عمر میں لاہور کے باغات پر فارسی میں ایک رسالہ لکھا جس کا نام "روضۃ الازہار" ہے۔ شاید اس مختصر تالیف نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی توجہ اکبری کی طرف مبذول کر دی۔ ۳۵-۱۸۳۴ء میں جب مہاراجہ نے پشاور کو فتح کیا تو فتح نامہ لکھنے کی خدمت امرناتھ اکبری کو سونپی۔ یہی فتح نامہ اپنی آخری شکل میں "ظفر نامہ رنجیت سنگھ" کے عنوان سے ایک قابلِ توجہ تالیف قرار پایا۔

اکبری نے شاعری میں ایک اردو و فارسی دیوان بھی یادگار چھوڑا ہے جس پر مفصل بحث آئندہ سطور میں آئے گی۔ اکبری کا انتقال ۱۸۶۷ء میں ہیضے کے اچانک حملے سے ہوا۔ وفات کے وقت اس کی عمر پینتالیس برس تھی۔ اس کی آخری غزل جو اس نے مرنے سے چند دن

پہلے اشاعت کیلئے بھجوائی تھی کوہ نُور لاہور میں ۶ راگست ۱۸۶۷ء کے شمارے میں شائع ہوئی۔ اس غزل کا مطلع ہے۔

شوراست چو ناقوس برہمن بسرما   از بتکدہ کم نیست دل ما بسرما[36]

اکبری کا قطعہ وفات مُفتی سرور لاہوری نے یُوں موزوں کی ہے۔

شد چو در دیوان گہ ملک بقا   آہ دیوانِ اکابر امرناتھ
رحلت او "فاضلِ علم اکبری" است   بار دیگر "ہائے شاعر امرناتھ"[37]

مولوی نورُ احمد چشتی:

مولوی نوُر احمد چشتی، مولوی احمد بخش یکدل کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ چہار شنبہ ہفتم ذی الحجہ ۱۲۴۲ھ (مطابق ۱۰ رجون ۱۸۲۹) کو پیدا ہُوئے۔ چھ سال کے ہُوئے تو ماں کا انتقال ہو گیا۔ ابتدائی تعلیم کچھ میاں عثمان کے مدرسے میں اور کچھ اپنے والدِ گرامی سے حاصل کی۔ والد نے تعلیم میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔ اپنی مشہور تالیف تحقیقاتِ چشتی میں اپنے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اور یہ کمترین لعمر چار دہ سالہ لفضلہ تعالیٰ شانہ' فارغ التحصیل ہوکر بامہربانی دیوان امرناتھ صاحب خلف راجہ دینا ناتھ صاحب جو بخشی فوج سواری مہاراج صاحب تھے، بعہدۂ وکالت شل فتح خاں نون میں باقرار پانچ روپیہ یومیہ سرفراز ہُوا۔[38]"

پندرہ سال کی عُمر میں خالصہ دربار سے چھوٹی سی جاگیر عطا ہُوئی اس کا ذکر آپ کے والد

۳۶۔ اکبری کے بیشتر حالات ظفر نامہ رنجیت سنگھ کے انگریزی مقدمے نوشتہ سیتارام کوہلی سے اخذ کیے گئے ہیں۔

۳۷۔ گنج تاریخ ص ۲۱۱۔

۳۸۔ تحقیقاتِ چشتی ص ۲۶۔

مولوی یکدل نے اپنی بیاضوں میں کیا ہے۔

پنجاب میں انگریزی دور شروع ہونے کے بعد مولوی نور احمد چشتی انگریزوں کو فارسی اور اردو پڑھانے پر معمور ہو گئے۔ ۱۸۵۸ء کے قریب مولوی نور احمد کی تدریسی خدمات امرتسر کے مشنری سکول میں منتقل کر دی گئی تھیں۔ مولوی نور احمد کا شمار اپنے عہد کے فاضل ترین افراد میں ہوتا ہے۔ آپ کو حضرت فیض اللہ شاہ چشتی ساکن کرنال سے بیعت طریقت حاصل تھی۔ آپ کی وفات ۱۸۶۷ء میں ہیضے کے حملے سے ہوئی۔ گویا اس سال ہیضے نے لاہور کو جن نامور شخصیتوں سے جدا کیا ان میں امرناتھ اکبری کے ساتھ مولوی نور احمد چشتی بھی تھے۔ مفتی غلام سرور نے درج ذیل قطعہ تاریخ موزوں کیا۔

نور احمد بخطہ لاہور	بود مشہور شاعر چشتی
سال فوتش ازیں سبب دل را	گشت منظور "شاعر چشتی"

نور احمد چشتی نظم و نثر دونوں پر مساوی قدرت رکھتے تھے۔ تالیفات کی تعداد زیادہ ہے لیکن جو کتابیں دست برد زمانہ سے محفوظ رہ کر مطبوعہ یا قلمی صورت میں باقی رہ گئی ہیں۔ ان میں تحقیقات چشتی، یادگار چشتی، تحفہ چشتی اور عجائبات چشتی اردو نثر اور دیوان چشتی اردو شاعری میں مولوی نور احمد چشتی کے فکر و فن کی نمائندگی کرتے ہیں۔ فارسی نثر میں خیالات دانش ایک عمدہ کتاب ہے۔ اردو تالیفات پر مفصل بحث آئندہ پیش کی جائے گی۔[۳۹]

مولوی محمد علی پردل:

مولوی نور احمد کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۲۵۲ھ (۱۸۳۶ء) میں پیدا ہوئے۔ پردل

۳۹۔ نور احمد چشتی کے حالات پر مفصل بحث کیلئے دیکھئے "یادگار چشتی" مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور کا مقدمہ نوشتہ گوہر نوشاہی نیز راقم الحروف کا مقالہ "عجائبات چشتی اور اس کا مصنف" مطبوعہ "قومی زبان" کراچی مارچ ۱۹۷۸ء

مولوی بیکدل کی دوسری بیوی کی اولاد سے تھے۔ تعلیم اپنے والد محترم سے حاصل کی۔ ۱۷ مارچ ۱۸۹۱ کو تپ کے عارضے سے انتقال ہُوا۔ اولاد میں دو بیٹے مولوی حامد علی چشتی اور احمد علی چشتی اور دو بیٹیاں رحیم النساء اور غنی النساء تھیں احمد علی چشتی بچپن میں فوت ہو گئے۔ مولوی حامد علی چشتی کثیر الاولاد ہُوئے۔

مولوی محمد علی پر دل اپنے عہد کے مشہور شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ فارسی اور اردو میں شعر کہتے تھے۔ خصوصاً تاریخ گوئی میں خاص مشق حاصل تھی۔ اس دور کی اکثر کتابوں کے خاتمے میں طباعت کی تاریخیں ان کے تخلص سے ملتی ہیں۔ مثلاً مولوی نور احمد چشتی کی تحقیقات چشتی و یادگار چشتی، مفتی غلام سرور لاہوری کی گلزار شاہی وغیرہ کے خاتمۃ الطبع کی تاریخیں اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں۔ مولوی محمد علی پر دل اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ گلزار شاہی کے لئے اردو میں تاریخ طبع موزوں کی ہے۔ نمونے درج ذیل ہیں جن سے اُن کی تاریخ گوئی میں مہارت کا پتہ چلتا ہے۔

تحقیقاتِ چشتی:

جو کوہ نور سے یہ نور چمکا	ہوا نوروں سے ہے نور اس کا اجالا
سروش غیب تاریخ اسکی پر دل	یہ ہے مصداق تحقیقات بولا

جو کی تصنیف چشتی نے یہ تحقیق	چھپی دیکھی نہ عالم یہ غضب ہے
کہی پر دل سے بہت بتالف نے تاریخ	یہ تحقیقات چشتی کی عجب ہے
	۱۸۷۶ء

گلزار شاہی:

ہوئی مطبوع جب گلزار شاہی	پھلا پھولا عجب بستان تاریخ
بسال بکرمی کہا دل نے پر دل	کہا ہنسکر بہار بستان تاریخ
	۱۹۳۰ء

مولوی غلام فرید، فرید:

کنھیا لعل ہندی نے اپنی مشہور تالیف تاریخ لاہور میں غلام فرید، فرید کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ سکھ عہد کے معروف شعراء میں سے تھے۔ فارسی اور اردو ہر دو زبانوں میں شعر کہتا ہے۔ تاریخ گوئی میں کامل استعداد حاصل ہے۔ تالیف کتاب یعنی ۱۸۸۲ء کے قریب کنھیا لعل کے بقول "اگرچہ یہ شاعر اب تک زندہ ہے، مگر پیری کی حالت پر پہنچ گیا تھا[۴۰]"۔

مفتی غلام سرور لاہوری:

مفتی غلام سرور ۱۸۲۸ء میں محلہ کوٹلی مفتیاں نزد حویلی میاں خان اندرون موچی دروازہ لاہور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام مفتی غلام محمد تھا، جو حضرت بہاؤالدین زکریا ملتانی کی اولاد سے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار اور مولوی غلام اللہ لاہوری سے حاصل کی۔ کنھیا لعل نے ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"یہ شخص اردو فارسی نظم قابل تحسین لکھتا ہے[۴۱]"۔

دوسری جگہ پر ان کے بزرگوں کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں ان کے بارے میں کنھیا لعل لکھتا ہے۔

"یہ شخص فی زمانہ ایک نامور عالم، فاضل، شاعر، مصنف اس خاندان کا چشم و چراغ ہے جس نے تمام عمر شاعری اور تصنیف و تالیف میں بسر کی۔ سترہ کتابیں نظم و نثر اردو و فارسی لکھیں۔ تمام زمانے میں نام پایا۔ اس نے خاص لاہور محلہ موروثی میں سکونت اختیار کی اور عالیشان حویلی بنوائی اور یہیں چند مکانات خریدے۔ اب[۴۲] مولف کتاب کے دفتر میں

---

۴۰ - تاریخ لاہور ص ۵۸

۴۱ - ایضاً

۴۲ - یعنی ۱۸۸۲ء میں۔

منشی کے عہدے پر ممتاز رہے[۴۳]۔ جناب کسری منہاس نے لکھا ہے کہ "آخری عمر میں مفتی صاحب مرحوم حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ ۲۷ ذوالحجہ ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۴ اگست ۱۸۹۰ کو داعی اجل کو لبیک کہا اور ان کی تاریخ وفات ان کا اپنا کہا ہوا مصرع ہے۔

مصرع: ابھی سرور نے کی ہے سرور عالم کی پابوسی[۴۴]

۱۳۰۷ھ

مفتی صاحب نے مختلف موضوعات پر اکیس کے قریب کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ جن میں مندرجہ ذیل اردو میں ہیں۔

حدیقۃ الاولیا، مدینۃ الاولیا، گلزار شاہی، تاریخ مخزن پنجاب، دیوان نعمت سرمدی مناقب غوثیہ، گلدستہ کرامت، انشائے یادگار اصغری، مخزن حکمت، تحفۃ الابرار وغیرہ۔

مفتی صاحب کی اکثر تالیفات ۱۸۵۷ کے بعد تالیف یا مرتب ہوئیں۔ لہٰذا ان کا ذکر آئندہ باب میں آئیگا۔

اِن شعراء کے علاوہ جو نوجوان شاعر میدان شعر و ادب میں وارد تھے ان میں احمد حسین خاں، مظہر حسن، بہادر شاہ[۴۵] بن سید چراغ شاہ سبزواری، انور شاہ واعظ کشمیری، محمد حسن شعری کشمیری، انور حسین ھما، جان محمد لاہوری ساکن امرتسر، مفتی غلام سرور لاہوری کے صاحبزادے مفتی غلام صفدر فوقانی، مفتی غلام حیدر حیدر، مفتی غلام اکبر لئیق، مفتی محمد انور دانش مفتی غلام سرور کے بھانجے سید علی شاہ الفت اور مفتی چراغ الدین روشن لاہوری قابل ذکر ہیں۔

۴۳۔ تاریخ لاہور ص ۵۶

۴۴۔ نقوش لاہور نمبر ص ۹۸۹

۴۵۔ یہ غالباً مولانا نور احمد چشتی کے برادر نسبتی تھے اور موچی دروازہ میں رہتے تھے۔

بطور کلی سکھ دور کے اردو شعراء کا بیشتر رجحان غزل کی طرف ہے۔ مثنوی اور قصیدہ بہت کم مقدار میں لکھے گئے۔ تاریخ نویسی کا رواج چونکہ سکھ دور میں عام تھا لہذا تاریخ گوئی اردو شعراء کا محبوب مشغلہ تھی۔ بعض شعراء کے شعری نمونے ہی قطعات تاریخ کی صورت میں ہیں بعض شعری تالیفات کا بطور خاص تذکرہ اہمیت سے خارج نہ ہوگا۔

دیوان امرناتھ اکبری

دیوان اکبری شاعر کی وفات کے بعد ۱۸۷۳ء میں ان کے بیٹے دیوان رام ناتھ کے اہتمام سے مطبع کوہ نور نے شائع کیا۔ منشی ہرسکھ رائے اور مطبع کوہ نور سے اکبری کے دوستانہ تعلقات تھے۔ مطبع کے اجرا کی تاریخ بھی اکبری نے کہی تھی جو ان کے دیوان میں موجود ہے۔ اکبری کے دیوان کا مسودہ جو غالباً اکبری کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے نیشنل میوزیم کراچی میں محفوظ ہے۔ اس کا فوٹوسٹیٹ ہمارے پیش نظر ہے۔ مطبوعہ دیوان مسودے کے مطابق نہیں۔ بعض اردو نظمیں اور غزلیں حذف کر دی گئی ہیں۔

دیوان اکبری اردو اور فارسی شاعری کا مخلوط مجموعہ ہے۔ پہلے صفحے سے ایک سو نو تک فارسی کلام ہے۔ صفحہ ایک سو دس سے ایک سو ستائیس تک اردو غزلیات ہیں جن کی تعداد چوبیس کے قریب ہے۔ اس کے علاوہ چند اردو قصائد اور تاریخیں ہیں۔

مولوی احمد بخش یکدل کے شاگردوں میں اکبری شعری اعتبار سے ممتاز حیثیت کا مالک ہے۔ زبان معیاری اور بامحاورہ ہے۔ غزل کا اعلیٰ شعور اور شعر کا ہنر اکبری کے کلام کی اہم خصوصیات ہیں۔ فارسی شاعری کے اظہارات سے آشنائی اور غزل کی روایت سے بطور کامل آگاہ ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی زمین میں ایک غزل اکبری کی شاعری کا قابل ذکر نمونہ ہے۔

غزل

مردانِ خدا خواہشِ دُنیا نہیں کرتے
آزاد رہ و رسم کی پرواہ نہیں کرتے

کیوں ہم کو دکھاتے نہیں تم دستِ حنائی
ہم خون کا کچھ آپ پہ دعویٰ نہیں کرتے

کب مانگتے ہیں کاکلِ شب رنگ سے ہم دل
عشاق سیہ دل کو تقاضا نہیں کرتے

جو مست ہیں گلزار سے کیا کام ہے ان کو
وہ عرش بریں پر بھی تماشا نہیں کرتے

فردوس میں جانے کی نہیں ہم کو تمنا
مولیٰ کی قسم خواہشِ عقبیٰ نہیں کرتے

ہم عشق میں سردار ہیں منصور کے اسلام
سرمایۂ کونین پہ سودا نہیں کرتے

عاشق کا ستانا نہیں معشوق کو منظور
جو ہم کو ستاتے ہیں وہ اچھا نہیں کرتے

غیروں سے کرم کرتے ہیں اور ہم سے مدادا
در پردہ وہ عشاق پہ کیا کیا نہیں کرتے

محفل میں غریبوں کی شرافت کہو ہم کو
اس طور کبھی دوست کو رسوا نہیں کرتے

بیعت کرے ساقی کی جسے ہووے ہدایت
دل دیویں اگر مست کو بیجا نہیں کرتے

غیروں کو عنائت سے شرف دیتے ہیں جب آپ
ہم آپ کو اس وقت بھی اپنا نہیں کرتے

ہر وقت تصوّر ہے مجھے آپ کا دل میں
کس بزم میں ہم آپ کا چرچا نہیں کرتے

اے اکبری ذرا یہ مصرع ہے ظفر کا
"وہ کون سی مے ہے کہ گوارا نہیں کرتے"

مولانا سیف الحق ادیب (متوفی ۱۸۹۹) نے دیوان کی اشاعت کا درج ذیل مادہ تاریخ منزول کیا ہے۔ اب مصرع یہاں طبع سُنئے۔

بے مثل ہے مخزن فصاحت
۱۸ ۶ ۷۳

دیوانِ چشتی

دیوانِ چشتی کے دو مخطوطے ہمارے کتاب خانے میں ہیں۔ ایک بے تاریخ، بدخط، دُوسرا باتاریخ، خوش خط، دونوں پر مُصنف کے دستخط موجود ہیں۔ بدخط نسخے کا کاغذ بھی دیمک خوردہ اور سائز $\frac{18 \times 22}{8}$ ہے۔ خوشخط نسخہ سفید اور نیلے رنگ کے انگریزی کاغذ پر لکھا ہے۔ ایرانی اصطلاح میں اسے "کاغذ ترمہ" کہتے ہیں۔ نسخے کا سائز درسی یعنی $\frac{20 \times 30}{16}$ ہے۔ یہ نسخہ مولوی نور احمد چشتی نے نہم ماہ رمضان ۱۲۷۸ھ مطابق گیارہ مارچ ۱۸۶۲ء کو منگل کے دن لاہور میں لکھ کر تمام کیا اور اس زمانے کی رسم کے مُطابق حاکمانِ وقت سے انعام و صلے کا طالب ہُوا۔ خاتمے پر مصنف کے نام کی دو عقیقی مہریں اور تین دستخط ہیں۔

دیوانِ چشتی میں ۱۷۷ غزلیں، چار مخمس، ایک واسوخت دو رباعیاں ایک مرثیہ

دو مادہ ہائے تاریخ ہیں۔ یہ تمام کلام اُردو میں ہے۔ ایک غزل بطور نمونہ درج کی جاتی ہے۔

غزل

عشق بتاں میں جب سے میں مشہور ہو گیا — عیش و نشاط سے میں بہت دُور ہو گیا

جذبات ہجر نے متواتر کیا ذلیل — زخمی جگر تھا آگے ہی اب چور ہو گیا

آیا جو ماہرو میرا کل رات میرے گھر — دیکھو اس کو رنگ شمع کا کافور ہو گیا

مدت سے دن کو رہتا ہوں بے چین دوستو — راتوں کا جاگنا مرا دستور ہو گیا

مذکور سن کے وعدہ خلافی تری کا آہ
چشتی میرا تو نور تھا اب چور ہو گیا

۱۸۴۹ء سے ۱۸۷۵ء تک اُردو نثر کے عمدہ اور مرتب نمونے بھی پنجاب کے دارالحکومت لاہور ہی میں دستیاب ہوتے ہیں۔ ۱۸۴۶ء کے بعد پنجاب کی حالت ایک نو دریافت جزیرے کی سی تھی اس سے پہلے پنجاب سیاسی اعتبار سے پورے ہندوستان سے کٹا ہوا تھا۔ سکھ گردی سے رنجیت سنگھ کے استحکام حکومت تک نصف صدی کا فاصلہ ہے۔ اس دوران میں ہندوستان، ریاستوں میں تقسیم نظر آتا ہے اور ہر ریاست ایک دوسرے سے خائف ہے یا خود اس قدر سیاسی قدرت اور استحکام نہیں رکھتی کہ اپنے مسائل سے فارغ ہو کر دوسری ریاستوں یا حکومتوں کے بارے میں خاطر خواہ معلومات جمع کر سکے۔ خود انگریز اپنے تمام تر وسائل اور نسبتاً بہتر طاقت کے باوجود پنجاب سے فاصلہ رکھنے پر مجبور تھے ۱۸۴۶ء کے بعد یہ صورتِ حال بدل گئی تھی۔ انگریزوں نے پنجاب کو حاصل کرنے کے فوری بعد پنجاب شناسی کے رجحان کو فروغ دیا اور پنجاب کے بارے میں معلومات فراہم کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔ پنجاب کے سیاسی غرور کو پامال کیا، لیکن اجتماعی شعور کو کچلنے کے بجائے لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ گویا پنجاب کے فکری مستقبل کی تعمیر میں انگریزوں نے اپنے ساتھ اہل پنجاب کو بھی شامل کیا۔ اس اجمال کی تفصیل آئندہ باب میں آئے گی۔ یہاں اُردو نثر کے چار اہم آثار کا تذکرہ کیا جاتا ہے

جو چار مختلف موضوعات پر اس دور کے علمی ادبی اور اجتماعی رجحانات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

پنجاب میں زبان اردو کا رواج سکھ دور سے ہی موجود تھا۔ سرکاری امُور کی زبان فارسی تھی۔ عوامی زبان پنجابی اور ادبی زبان اُردو تھی۔ اس کے علاوہ سفارتی سطح پر بھی اُردو کا رواج تھا۔ بعض شہادتوں کے مطابق مہاراجہ رنجیت سنگھ سفیروں سے اُردو میں بات چیت کرتا تھا۔ انگریزی حکومت کے قیام کے بعد حکمرانوں کے لئے سب سے اہم مسئلہ ملکی زبان سے آشنائی کا تھا۔ لہٰذا نئے حکمرانوں نے دیسی استادوں کی مدد سے اُردو زبان سیکھنا شروع کی۔ انہی استادوں میں سے ایک مولوی نور احمد چشتی بھی تھے۔ جن کا چند پُشت سے پیشہ آبائی معلمی تھا۔ مولوی نُور احمد نے بدلتے ہُوئے حالات کے نئے تقاضوں کو بھانپ لیا اور اپنی تدریسی خدمات کو انگریزوں کے حوالے کرنے میں مصلحت سمجھی۔ لارڈ لارنس سے لیکر سی۔ یُو ایچیسن اور رچرڈ ٹمپل تک مولوی نوُر احمد کے شاگرد تھے۔ انہی شاگردوں میں سے بعض کے لئے انہوں نے درسی کتابیں بھی لکھیں۔ اس طرح عوامی زندگی اور رسم و رواج کو بہتر طریقے سے جاننے کیلئے انگریزوں کے لئے پنجاب کے تمدنی کوائف قلمبند کئے گئے۔ بعض لوگوں نے باہر سے پنجاب میں سیاحتیں کیں اور اپنے مسافرتی کوائف کو اردو میں لکھا۔ جن چار آثار کا پہلے ذکر کیا گیا ہے ان کے تفصیلی کوائف درج ذیل ہیں۔

تحفۂ چشتی

تحفۂ چشتی مولوی نوُر احمد چشتی کی تصنیف ہے۔ موضوع اردو حرف و نحو یعنی گرائمر ہے بعض خصُوصیات کے اعتبار سے پنجاب میں لکھی جانے والی اردو میں فنی نثر کی قابلِ ذکر کتابوں میں سے ہے۔ بلکہ یُوں کہنا چاہئیے کہ تحفۂ چشتی پنجاب میں اُردو زبان میں لکھی ہوئی پہلی اردو گرائمر ہے۔

یہ کتاب پادری جان ہنٹر مارسن کے لئے لکھی گئی ہے اور بقول مُصنف اس میں علم قواعد اور تشریح اضافت وغیرہ کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

تحفۂ چشتی ۲۱ مارچ ۱۸۵۴ء مطابق ۲۱ جمادی الثانی ۱۲۷۰ھ کو مکمل ہو کر پنڈت بشن ناتھ مشتاق خلف پنڈت اجودھیا پرشاد کے اہتمام سے اسی سال مطبع لاہور گزٹ میں شائع ہوئی۔ کتاب کا دوسرا ایڈیشن منشی محمد عظیم کے اہتمام سے مطبع پنجابی لاہور سے ۱۲۷۳ھ میں شائع ہوا۔

تحفۂ چشتی فنی نثر کا عمدہ نمونہ ہے۔ بطور مثال مسند اور مسند الیہ کی تعریف ملاحظہ ہو۔

"کلام میں وہ نسبت جو درمیان دو کلموں کے ہے اس طرح پر ہوتی ہے کہ سبب اس کے سکوت صحیح ہوتا ہے اور اسکو اسناد کہتے ہیں۔ پس وہ کلمہ کہ جس کی اسناد کسی کی طرف پھیریں اس کو مسند کہتے ہیں اور جس کی طرف مسند ہو اس کو مسند الیہ کہتے ہیں اور مسند اور مسند الیہ کا کلام میں واقع ہونا دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا تو دونوں اسم ہوں تو اس کلام کو جملہ اسمیہ کہتے ہیں اور مسند الیہ کو مبتدا اور مسند کو خبر کہتے ہیں پھر وہ دونوں اسم خواہ جامد ہوں جیسے وہ زید ہے وہ مبتدا اور زید خبر اور "ہے" حرف ربط خواہ ایک جامد اور دوسرا مشتق یا ایک اسم اور دوسرا فعل[۴۶]۔"

یادگار چشتی

یادگار چشتی مولوی نور احمد چشتی کی اہم نثری تصنیف ہے۔ یہ کتاب پنجاب کی تہذیبی زندگی کی ایک نایاب دستاویز ہے۔ پنجاب میں بسنے والے مختلف اقوام اور انسانی گروہوں کے رسم و رواج اور تہذیب و تمدن کو جس فن کارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔

مولوی نور احمد چشتی نے یہ کتاب ۱۸۵۶ء میں جارج او بارنس کے پاس خاطر سے لکھنی شروع کی اور اور ایڈورڈ ہولوٹ بیز سی۔ ڈبلیو فورمن کی تشویق پر مکمل کی۔ یہ کتاب ۱۸۵۸ء میں مطبع لاہور کرانیکل سے شائع ہوئی۔

۴۶۔ نور احمد چشتی، تحفۂ چشتی، لاہور، مطبع پنجابی، ۱۲۷۳ھ ص ۱۰۹

یادگار چشتی کی نثر اس دور کی بہترین اردو نثر ہے۔ اہل پنجاب کا اسلوب تحریر اردو کے باقی مراکز سے جداگانہ ہے۔ نثر کی تمام خوبیاں جو لکھنے والے کو صفِ اول میں جگہ دیتی ہیں، پنجاب کی نثر میں موجود ہیں۔ اظہار کا ہر پہلو اور ابلاغ کا ہر حُسن اہل پنجاب کی نثر میں موجود ہے۔ یادگار چشتی کی زندہ نثر پنجاب کے نثری ادب کی نمائندہ ہے چند اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

جولاہہ کا حال:

"جولاہہ بھی ایک قوم ہے۔ اس کو کاسبی، نور باف اور بافندہ بھی کہتے ہیں۔ یہ لوگ دیسی کپڑے بنتے ہیں اور عورتیں ان کی تانا تنتی ہیں۔ اس ملک کا یہ معمول ہے کہ جب کسی کو کپڑا بنانا منظور ہوتا ہے تو جولاہے کو بلا کر سوت واسطے کپڑا تیار کرنے کے دیتا ہے اور جب تیار ہو جاتا ہے تو چادروں کے حساب سے اسکو مزدوری ملتی ہے[۴۷]"

سنار کا حال:

. . . . جب یہ لوگ چاندی سونے کو گلانا چاہتے ہیں تو اس کو بوتر میں، کہ کٹھالی کر کے مشہور ہے، رکھتے ہیں اور پھر اس کٹھالی کو آگ پر دھرتے ہیں اور اوپر اس کے کوئلے رکھتے ہیں اور پنکھے سے سلگاتے ہیں۔ جب کوئلے خوب دہک جاتے ہیں تو پھر نال سے پھونکتے ہیں۔ پھر اس چاندی یا سونے میں سوہاگا ڈالتے ہیں وہ گل جاتا ہے۔ پھر اس کٹھالی کو چمٹے سے پکڑ کر نکالتے اور ریزے میں تھوڑا سا تیل ڈال کر الٹ لیتے ہیں۔ پھر سرد کر کے جو بنانا ہوتا ہے بناتے ہیں اور ایک ہتھیار ان کا کترنے کے واسطے ہے اسکو کات کہتے ہیں اور سب ہتھیاروں کے نام یہ ہیں۔ کات، سوہن، ہتھوڑا، کھل، سندان اور کانٹا جس سے وزن کرتے ہیں۔ چاندی کو کستے اور

۴۷۔ یادگار چشتی، اکتوبر ۱۹۷۵، ص ۱۳۸۔

سونے کو پھٹکری، نمک، نوشادر سے رنگ دیگر جلا کرتے ہیں[۴۸]"۔

بیان کھیلوں کا :

"سُرخ - ایک چھوٹا چھوٹا جانور ہے ۔ یہ بانس کے پنجرے میں رکھے جاتے ہیں بُرخ بہت خوبصورت چڑیا اور خوش آواز ہوتا ہے اور سُرخ لڑتے بھی ہیں ۔ سُرخ کی مادیں کو پتی کہتے ہیں ۔ یہ جانور بھوک سے نہیں لڑتے، فقط عشق سے لڑتے ہیں[۴۹]"۔

سفرنامہ امین چند

سفرنامہ امین چند کی تصنیف ۱۸۵۰ء میں شروع ہوئی ۔ یہ اردو میں لکھے جانے والے سفرناموں میں اپنے اسلوب تحریر اور مواد کے اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل ہے ۔ امین چند کا مشاہدہ زندگی کے مختلف شعبوں کا احاطہ کرتا ہے ۔ اس کا بیان محض جغرافیائی یا تاریخی کوائف ہی پیش نہیں کرتا بلکہ مختلف شہروں کی جیتی جاگتی زندگی کی تصویر بناتا ہے ۔ اسے ایک اعتبار سے پنجاب کا پہلا مکمل سفرنامہ کہنا چاہیے، جو اردو زبان میں لکھا گیا ہے ۔ دیباچے میں صراحت کی گئی ہے کہ مؤلف رہنے والا ملک پنجاب کا ہے اور سبب تالیف یوں بیان ہوا ہے ۔

"راقم کو خوبی قسمت سے بیچ سال ۱۸۵۰ء، ۱۸۵۱ء اور ۱۸۵۳ء کے ایسا اتفاق سفر کا ہوا کہ اس سیاحت میں بہت سا حصہ ملک ہندوستان کا دیکھا گیا ۔ مثلاً تمام شمالی حصہ ہند کا تا بمبئی جانب غرب اور مشرقی حصہ تا بہ کلکتہ و جگن ناتھ اور دریائے سندھ سیر کیا گیا ۔ کشمیر کے پہاڑوں سے کراچی تک اور ویسا ہی دریائے گنگا جی مقام رکھی کیش اور ہر دوارے سے تا بہ کلکتہ اور وہاں سے براہ خشکی جگن ناتھ تک،

---

۴۸ - یادگار چشتی ص : ۱۷۹

۴۹ - ایضاً ص : ۱۹۴

لیکن یہ سفر خشکی اور تری کا نہ بارادہ سرکار تھا نہ برائے کار تجارت اور نہ واسطے سیر تھا جانزا کے بلکہ صرف بارادہ تحصیل علم اور حصول واقفیت حال اور ملکوں کے۔ کس واسطے کہ مجھ کو سیاحی کا ایسا شوق پیدا ہوا کہ عہد جلیلہ تحصیلداری کو جو ایک ضلع پنجاب میں تحت حکومت صاحبان بورڈ پنجاب تھا۔ اپنی خوشی و رضامندی سے چھوڑ کر سفر پر کمر باندھی اور جس جس ملک میں جانے کا اتفاق ہوا وہاں کے حالات اور مکانات عجیب و غریب کو جو قابل سیر کے تھے بخوبی دلجمعی کے ساتھ دیکھا اور بھی ہر ملک کے باشندوں سے ملاقات حاصل کر کر انکی راہ و رسم سے واقفیت حاصل کی اور جن مقامات میں گذر محال تھا انکو بمحصول چٹھیات سفارش ملاحظہ کیا غرضیکہ حتی الامکان ہر ایک امر میں بہت سی تحقیقات اور تفتیش کر کر حال ہر ایک قلمبند کیا۔"[۵۰]

امین چند نے مواد کی فراہمی میں مشاہدے مطالعے اور شنید تینوں سے کام لیا ہے اور یوں یہ سفرنامہ انیسویں صدی میں پنجاب کو پہچاننے کا عمدہ ذریعہ ہے۔

زبان نہایت شستہ با محاورہ اور عام فہم ہے۔ جغرافیائی اور تاریخی کوائف کے بیان سے قطع نظر کر کے چند اقتباس پیش کئے جاتے ہیں۔ امید ہے قارئین ادب کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ کشمیر کے حماموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"چونکہ یہ ملک برفانی ہے اس واسطے یہاں پر سینکڑوں حمام جابجا بنے ہوئے ہیں اور جاڑے کے دنوں میں بغیر حمام کے گذارہ مشکل سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر ایک امیر کے گھر میں حمام بنا ہوا ہے اور سینکڑوں حمام کرایہ کے عوام الناس کے واسطے ہیں

۵۰۔ امین چند، سفرنامہ امین چند، لاہور، پنجاب پریس، ۱۸۵۹ء ص: ۱، ۲۔

جب حمام کے اندر جاؤ تو وہ ایسا گرم ہوتا ہے کہ باہر اسکی کیسی ہی برف گرے
مگر اسکی اندر کپڑے پہننے کی ضرورت نہیں ۔ اور نہا کر طبیعت بہت خوش ہوتے
ہیں اور بدن نہائت صاف اور ہلکا ہو جاتا ہے۔[51]"

دہلی کے تاریخی اور جغرافیائی مطالعے کے بعد یہاں کے ادیبوں اور دانشمندوں کا یوں ذکر
کیا ہے ۔

"اس شہر میں اکثر لوگ بڑے عالم فاضل ہیں ۔ حال ان کا قابل تذکرہ ہے ۔ چنانچہ
ان دنوں میں جو لوگ بڑے نامور اور اپنے علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں
نام اُن کا ذیل میں لکھتا ہوں ۔

(ان ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں میں شیخ بدرالدین مہرکن، میر محمد امیر پنجہ کش
مفتی صدرالدین، شیخ ابراہیم ذوق، مرزا غالب، ماسٹر رام چندر اور ناصر احمد ہیں کار
کا تذکرہ موجود ہے ۔)

اس دور کا سب سے اہم کارنامہ مطابع کا قیام اور اخبارات کا اجرا ہے ۔ پنجاب میں
سب سے پہلا چھاپہ خانہ انگریز مشنریوں نے لدھیانے میں قائم کیا ۔ اس مطبع کے بانی مشنری سکول
لدھیانہ کے سرپرست کیپٹن ویڈا اور مسٹر لوری تھے ۔ مطبع ۱۸۳۵ میں قائم ہوا ۔ ۱۸۴۸ میں
منشی محمد عظیم اس مطبع کو خرید کر لاہور لے آئے اور اس کا نام لاہور کرانیکل رکھا ۔

۱۸۴۹ میں لالہ ہرسکھ رائے نے "کوہ نور" کے نام سے لاہور میں ایک مطبع قائم کیا
دیوان امرناتھ اکبری نے درج ذیل تاریخ کہی ۔

چھاپہ خانہ لالہ ہرسکھ رائے کا　　　ہے بنا جس دن سے مثل کوہ نور

---

۵۱ ۔ سفرنامہ امین چند ۔ ص : ۹۰، ۹۱ ۔

دل کو حیرت تھی کہ آیا کس لئے | نام نامی کوہ نور اس کا رکھا
کوہ سنگین سے ہے کیا نسبت اسے | کیا متانت سے ہے اس کا مدعا
جب نہ جانا کچھ تو جانا یہ کہ ہے | اختراع تازہ از بہر بہا
الغرض اس کی ہے یہ تاریخ سال | چھاپہ خانہ لالہ ہرسکھ رائے کا[۵۲]
۱۲۶۶ھ

فقیر سید سراج الدین نے ۱۸۵۰ء میں لاہور میں مطبع دریائے نور کی بنیاد رکھی جس کی تاریخ مولوی احمد بخش یکدل نے "شد شہانہ مطبع دریائے نور" موزوں کی۔[۵۳] فقیر صاحب موصوف نے ۱۸۵۱ء میں ایک اور مطبع امرتسر میں باغ نور کے نام سے جاری کیا جو شاید بہت جلد بند ہو گیا۔[۵۴]

لدھیانہ سے ۱۸۵۱ء میں مطبع "نور علی نور" کے قائم کی خبر معاصر اخبارات میں موجود ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس مطبع نے فقط پانچ ماہ کام کیا۔[۵۵]

ملتان میں منشی محمد مہدی حسن خاں کی کوشش سے ایک مطبع "ریاض نور" کے نام سے قائم ہوا۔ اس کا قیام ۱۸۵۱ء کے قریب ہے۔[۵۶] اسی طرح ۱۸۵۳ء میں سیالکوٹ میں ایک مطبع چشمۂ فیض کے قیام کی اطلاع ملتی ہے۔ جس کے مالک منشی دیوان چند تھے۔[۵۷]

---

۵۲ - امرناتھ اکبری، دیوان اکبری، لاہور، کوہ نور، ۱۸۷۳ء ص ۱۲۸ -

۵۳ - بیاض یکدل شمارہ ۱۶ ف ۴۷ .

۵۴ - امداد صابری، تاریخ صحافت جلد اول، دہلی، چوڑیوالان، ۱۹۵۳، ص ۳۵۴ .

۵۵ - ایضاً ص ۳۵۴ .

۵۶ - ایضاً ص ۳۵۴ تا ۳۷۴ .

۵۷ - ایضاً ص ۵۲۴ .

مطبع شعاعِ شمس، حضرت شاہ شمس کے شہر ملتان میں ۱۸۵۳ء کے قریب قائم ہوا اس کے مالک فقیر غلام نصیر الدین تھے۔ گارسین دتاسی نے بھی اپنے خطبات میں ایک جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ مطبع پنجاب میں زبان و ادب کی ترویج اور ترقی میں بے حد فعال ثابت ہوئے۔ ان میں سے ہر مطبع نے اپنا ایک اخبار جاری کیا۔ یہ اخبار ایک طرف ملکی سیاست کو عوام تک پہنچانے اور دوسری طرف ادیبوں کی حوصلہ افزائی اور قدر دانی میں کوشاں ہوئے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ صحافت کے پلیٹ فارم سے ہی انگریزی کے بجائے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا نعرہ بلند ہوا۔ قبل ازیں کہ اس دور کی صحافت کی اہم خصوصیات بیان کی جائیں ۱۸۵۷ء تک کے اخبارات کا مختصر جائزہ بے محل نہ ہوگا۔

کوہِ نور، لاہور۔

۱۲ جنوری ۱۸۵۰ء کو لالہ ہرسکھ رائے کے مطبع کوہ نور سے ہفتہ وار اخبار "کوہ نور" جاری ہوا۔ جنوری ۱۸۵۰ء کے "اسعد الاخبار" آگرہ میں کوہ نور کے اجرا کی خبر ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لالہ ہرسکھ رائے کوہ نور سے پہلے جام جمشید (میرٹھ) کے بھی ایڈیٹر تھے۔ گورنمنٹ کی رپورٹ مرتبہ ۱۸۵۰ء میں لکھا ہے کہ:

۲۲۷

"اس صوبے کے اخباروں میں کوہ نور ہی کی اشاعت سب سے زیادہ ہے یعنی ایڈیٹر کا بیان ہے کہ پنجاب کے بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کی سرپرستی میں اس اخبار کا اجرا ہوا ہے۔"

۱۸۵۱ء کی رپورٹ کے مطابق کوہ نور ہفتے میں دو بار شائع ہوتا ہے۔ اشاعت گر کر ۸۹ء رہ گئی ہے۔ ۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۳ء کی رپورٹوں میں ایڈیٹر کی تعریف اور اخبار کی اشاعت میں ترقی کا ذکر ہے۔ ہندوؤں کے بعد خریداروں کی سب سے بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی۔ ۱۸۵۲ء کی رپورٹ میں لکھا ہے کہ اس اخبار کی اردو بہت سادہ ہوتی ہے۔ اور ۱۸۵۳ء کی رپورٹ میں ذکر ہے کہ یہ اخبار گورنمنٹ کے بتلائے ہوئے

اصولوں پر مرتب کیا جاتا ہے اور لوگوں میں روشن خیالی پیدا کرنے اور ان کی ترقی و بہبود میں ممد ہو رہا ہے[58]۔

گلزار پنجاب :

۱۸۵۰ء میں گوجرانوالہ سے جاری ہوا۔ اس کے ایڈیٹر منشی کندامل تھے[59]۔

دریائے نور :

دسمبر ۱۸۵۰ء میں فقیر سید سراج الدین نے لاہور سے دریائے نور جاری کیا۔ گورنمنٹ رپورٹ کے مطابق پہلے ایڈیٹر کا نام نجیب الدین حسین تھا[60]، لیکن ڈاکٹر عبد السلام خورشید نے فقیر سید شہسوار الدین کو ایڈیٹر لکھا ہے[61]۔ مولوی احمد بخش یکدل کے روزنامچوں میں بھی اس کا ذکر موجود ہے چنانچہ یکدل نے مطبع اور اخبار کے اجرا کی درج ذیل تاریخ موزوں کی ہے[62]۔

چیست آں تاریخ ایں یک مصرعست   "سند شہانہ مطبع دریائے نور"
۱۸۵۰

نور علی نور :

عتیق صدیقی کی مرتبہ رپورٹ کے مطابق نور علی نور کا اجرا ۱۸۵۱ء میں لدھیانے سے ہوا[63]۔ ڈاکٹر عبد السلام خورشید نے لکھا ہے کہ ۱۸۵۶ء میں منشی دیوان چند نے خورشید پنجاب کے

۵۸۔ صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات ص ۱۲۶

۵۹۔ ڈاکٹر عبد السلام خورشید، صحافت پاکستان و ہند میں، لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۶۳ء ص ۱۲۱

۶۰۔ صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات ص ۱۲۸

۶۱۔ صحافت پاکستان و ہند میں۔ ص 119

۶۲۔ بیاض یکدل شمارہ ۱۶ ف ۷۶

۶۳ صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات ص ۱۲۵

مقابلے میں سیالکوٹ سے نورٌ علیٰ نور دوبارہ جاری کیا۔[۴۴]

باغِ نور :

۱۸۵۱ء میں ہی امرتسر سے فقیر سید سراج الدین نے اپنا دوسرا اخبار باغِ نور جاری کیا بکیدل کی ڈائریوں میں اس مطبع اور اخبار کی ایک مزاحیہ رنگ میں تاریخ موجود ہے، جس کو نقل کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

چشمۂ فیض :

۱۸۵۲ء میں سیالکوٹ سے جاری ہوا۔ ایڈیٹر منشی دیوان چند تھے۔

ہمائے بے بہا :

۱۸۵۲ء میں منشی دیوان چند نے لاہور سے جاری کیا۔

ریاض نور :

۱۸۵۲ء میں ملتان سے منشی مہدی حسن کی ادارت میں جاری ہوا۔

مطلع انوار :

۱۸۵۴ء میں گجرات سے جاری ہوا۔

خورشید پنجاب :

۱۸۵۶ء میں منشی دیوان چند نے جاری کیا۔

یہ اخبارات برائے نام نہ تھے، بلکہ اپنے زمانے میں آزادیٔ فکر، آزادیٔ صحافت اور آزادیٔ قلم کے علمبردار تھے۔ ان میں سے منشی ہرسکھ رائے اور منشی دیوان چند کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ حکومت کے ترجمان ہیں، لیکن بالآخر انھیں بھی عوام کی خواہشات

---

۴۴ - صحافت پاکستان و ہند میں - ص ۱۳۸ -

کا احترام کرتے ہوئے حکومت پر تنقید کے الزام میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں
اس سلسلے میں فقیر سید سراج الدین کے اخبارات کا ذکر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ فقیر
صاحب محکمہ پولیس کے استعمار گرانہ تشدد کے خلاف سینہ سپر تھے۔ جس کی سزا میں ان
اخباروں کو حکومت کی طرف سے کوئی امداد حاصل نہیں ہوتی تھی۔ فقیر صاحب نے اخباروں کو
ابدی نیند سلا دیا لیکن حکومت کا آلۂ کار نہیں بننے دیا۔

یہ اخبارات محض سیاسی یا سماجی خدمات ہی نہیں بجا لاتے تھے بلکہ جیسے پہلے
عرض کیا گیا ہے اس زمانے کے ادبی رجحانات کا اہم مرکز بھی تھے۔ ان میں سے بعض کے ایڈیٹر
اپنی شستہ اور معیاری اردو کے اعتبار سے ملک گیر شہرت رکھتے تھے۔ ریاض نور ملتان کے
ایڈیٹر منشی مہدی حسین خان ملتان کے تحصیلدار کی ریشہ دوانیوں کو بے نقاب کرنے کی پاداش
میں قید ہو گئے تھے۔ لیکن ۱۸۵۳ء کی گورنمنٹ رپورٹ میں اخبار کی زبان کو شستہ، طرز تحریر
کو اچھا اور ایڈیٹر کو اول درجے کا ادیب لکھا گیا ہے[۶۵]۔

۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۷ء تک پنجاب میں انگریزی حکومت ملکی نظم و نسق اور امن عامہ
کی بحالی کے ساتھ ساتھ اپنے حاکمانہ تسلط میں مصروف رہی۔ نافذ شدہ اصلاحات کا تفصیلی
ذکر سید محمد لطیف کی تاریخ پنجاب میں موجود ہے۔ یہاں اشارۃً صرف اتنا عرض کرنا کافی
ہے کہ پنجاب کے پہلے چیف کمشنر لارڈ لارنس اور ان کے ہمکار افسروں کی انتظامی حکمت
عملی میں مندرجہ ذیل نکات خاص طور پر اہم تھے۔

۱۔ جوڈیشل اور فنانس کمشنروں کا تقرر۔

۲۔ ٹاؤن ٹیکس کو منسوخ کر کے بڑے شہروں میں محصول چنگیوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔

۶۵۔ صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات ص ۱۳۱

۳- جیل خانوں میں بعض اصلاحات نافذ کی گئیں۔ مثلاً قیدیوں کی مشقت سے استفادہ کیا گیا اور اس قدر کو قیدیوں کے مستقبل کے لئے سودمند بنانے کا طریق کار مرتب ہوا۔

۴- مردم شماری از سر نو کی گئی۔ اس وسیلے سے پنجاب شناسی کو اہم موضوع قرار دیا گیا اس پالیسی کا علمی اور ادبی ردِ عمل مختلف صورتوں میں ظاہر ہوا۔ جس پر آئندہ صفحات میں بحث کی جائے گی۔

۵- سڑکوں کی تعمیر ہوئی اور شاہراہوں میں آمد و رفت اور نقل و حرکت کو آسان بنایا گیا۔

۶- ملک میں سرکاری سطح پر درخت کاری کی گئی جس سے نہ صرف شادابی و سرسبزی پیدا ہوئی بلکہ شہروں کی زیبائی میں بھی اضافہ ہوا۔

۷- ٹھگی اور رہزنی کا انسداد اور سدِ باب کیا گیا، تاکہ لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کی جا سکے۔

۸- مزدوروں اور کاریگروں کے محنتانے کا تحفظ کیا گیا۔

۹- کسانوں اور مزارعین کے حقوق پر توجہ دی گئی، اور انھیں جاگیرداروں کے درمیان آبرومندانہ زندگی گزارنے کا یقین دلایا گیا۔ اس سلسلے میں جو اہم اقدام کئے گئے اُن میں سے ایک یہ تھا کہ نمبرداروں اور چوہدریوں کے مزارعین پر غیر ضروری تحکم کو کم کیا گیا۔ بیگار کے مذموم نظام کو ختم کر کے نمبردار یا چوہدری کو دیہاتیوں کے درمیان عام بھائی چارے کا وسیلہ قرار دیا گیا۔ دوسرے یہ کہ حاضر فصل یا بوئی ہوئی اور خالی یا ناقابلِ کاشت زمین پر مالیے کی شرحیں مقرر کر کے بطور عمومی زمین پر مالیات میں کمی کر دی گئی۔

سید محمد لطیف نے اس تمام بحث کا خلاصہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پانچ سال کے قلیل عرصے میں انگریزوں نے داخلی اور خارجی اعتبار سے پنجاب کی شکل تبدیل کر دی تھی[۶۶]۔ سید محمد لطیف کے

66. History of the Punjab P. 576, 577

بیانات پر تنقیدی تبصرہ ہمارے موضوع سے خارج ہے ۔ بطور مختصر یہ کہ ۱۸۴۹ سے ۱۸۵۷ تک ابھی انگریز اچھی طرح سے پنجاب کو سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ جنگِ آزادی کے مُلک گیر طوفان نے انھیں گھیرے میں لے لیا ۔ اِس طوفان کا مرکز ہندوستان کے وہ علاقے تھے جن پر انگریزوں کا تسلّط یا تو بالواسطہ تھا اور یا یہ تسلّط زیادہ مستحکم نہ تھا ۔ پنجاب کی صُورتِ حال اس سے مختلف تھی ۔ ستلج پار کا پنجاب سال ہا سال سے انگریزوں کی قلمرو میں تھا ۔ اور وہاں کی ریاستوں کی فوجی طاقت دراصل انگریزوں کی اپنی طاقت تھی اور ستلج کے اس پار یعنی مغربی کنارے کا پنجاب دس گیارہ سے عملاً اور آٹھ سال سے بطور مطلق انگریزوں کے قبضے میں تھا یہی سبب ہے کہ بعض مورخین نے عدم اطلاعات کی بنا پر جنگِ آزادی میں پنجاب کے حصّے کو بالکل معمولی قرار دیا ہے ۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے ۔ جنگِ آزادی میں پنجاب کے حصّے کا مفصل بیان تاریخ نویسی کا موضوع ہے ، اس محدود مقالے میں پوری طرح نہیں سمویا جا سکتا تاہم بطور خلاصہ پنجاب کے چند اہم شہروں کی تصویریں پیش کی جاتی ہیں ۔ تاکہ پنجاب میں جنگِ آزادی کی رُوح کی نشان دہی اور اس کے اثرات کا پنجاب میں پیدا ہونے والے اُردو ادب کے حوالے سے جائزہ لیا جا سکے ۔

لاہور ۔

پنجاب کا دارالحکومت ، سر جان لارنس کی حکومت میں تھا ۔ لیکن نعرۂ آزادی کے موقع پر جان لارنس لاہور میں موجود نہ تھا ۔ رابرٹ منٹگمری ، جوڈیشنل کمشنر کو میرٹھ کے واقعات کی خبر ملی تو لاہور کے انتظامات پر متوجہ ہُوا ، لاہور میں تحریکِ آزادی کی سرگزشت اور انگریزی مظالم کی داستان باری علیگ نے ایڈورڈ تھامسن کی تالیف " تصویر کا دُوسرا رُخ " The other side of the medal اور دیگر معتبر مورخین کی شہادتوں سے بیان کی ہے لاہور کی سرگذشت باری علیگ کے ہاں مندرجہ ذیل ہے ؛

"جب لاہور میں میرٹھ کے دیسی سپاہیوں کی خبر پہنچی تو اس وقت لاہور میں مقیم دیسی سپاہیوں میں جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ اس وقت سر جان لارنس لاہور میں موجود نہیں تھا۔ لاہور میں انگریز حکام نے پنجاب کو بغاوت سے دور رکھنے یا بغاوت ہونے کی صورت میں اسپر فوری قابو پا لینے کے لئے ایک اجلاس کیا۔ اس اجلاس میں یہ فیصلہ ہُوا کہ میاں میر (لاہور چھاؤنی) کے دیسی سپاہیوں سے ہتھیار چھین لئے جائیں اور لاہور کے قلعہ کو مزید مضبوط کرنے کے لئے وہاں انگریز سپاہیوں کو بھیج دیا جائے۔ دیسی سپاہیوں سے ہتھیار چھین لئے گئے اور ان کی نقل و حرکت کی نگرانی ہونے لگی۔

۳۰ر جولائی کو پرکاش سنگھ اپنی تلوار لیکر نکلا اور اپنے ساتھی سپاہیوں سے کہنے لگا کہ وہ فرنگیوں کو قتل کر دیں۔ سب سے پہلے اس نے میجر سپنسر کو قتل کیا۔ اسی اثنا میں آندھی چلنے لگی۔ باغی سپاہی میاں میر سے بھاگ نکلے۔ گرفتار ہونے والوں کو توپ دم کر دیا گیا۔ اب باغی سپاہیوں کا تعاقب شروع ہُوا۔ باغیوں کی ایک بہت بڑی تعداد راوی پار ہو کر ایک چھوٹے سے ٹاپو میں اتر پڑی۔ انگریزی فوج کا ایک دستہ کشتیوں میں سوار ہو کر ٹاپو کی طرف بڑھا۔ باغیوں نے ہاتھ اُٹھا دیئے۔ اُنھیں کناروں پر لایا گیا۔ باغی سپاہیوں کے ہاتھ باندھ کر انھیں اجنالہ کے تھانے میں پہنچا دیا گیا۔ فریڈرک کوپر کے بیان کے مطابق آدھی رات تک سارے باغیوں کو اجنالہ کے تھانے میں پہنچا دیا گیا۔ بارش ان سپاہیوں کی موت میں حائل ہو گئی۔ سپاہیوں کے قتل کو اگلے دن پر اٹھا رکھا۔ پھانسیوں کے لئے رسّے بھی تھے اور باغیوں کو ایک ساتھ قتل کرنے کے لئے پچاس سکھوں کا ایک دستہ بھی موجود تھا۔ گرفتار ہونے والے سپاہیوں کی تعداد دو سو بیاسی تھی۔ چونکہ یکم اگست کو عید الضحیٰ تھی اسلئے انگریزی فوج کے مسلمان سواروں کو امرتسر بھیج دیا گیا تاکہ وہ وہاں عید منائیں۔ اس بہانے سے مسلمان سواروں کو اجنالہ سے امرتسر بھیج دیا گیا۔ ایک عیسائی

افسر اپنے وفادار سکھوں کی مدد سے اگلی صبح ایک مختلف قسم کی قربانی کرنے کیلئے وہاں رہ گیا۔

اگلی صبح سنتریوں نے لوگوں کے ہجوم کو اس طرف آنے سے روکے رکھا۔ افسروں کو جمع کرکے اس منظر کے اسباب سے آگاہ کیا گیا، جو بہت جلد ان کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا۔ باغیوں کو دس دس کی ٹولیوں میں تھانے سے باہر نکالا جاتا۔ پشت کی طرف ایک ہی رسّی سے ان کے ہاتھ باندھ دیئے جاتے۔ فائرنگ پارٹی انہیں اپنی گولیوں کا نشانہ بنا لیتی۔ جب ایک سو پچاس باغی مارے جا چکے تھے تو ایک جلاد غش کھا کر گر پڑا۔ لہٰذا جلادوں کو آرام کرنے کا تھوڑا سا وقفہ دیا گیا۔ آرام کے بعد پھر قتل کا سلسلہ شروع ہوا۔ جب دو سو سینتیس[۳۷] سپاہی مارے جا چکے تو اطلاع دی گئی کہ باقی ماندہ سپاہی برج سے باہر نکلنے سے انکار کر رہے ہیں۔ دروازے کھولے گئے وہ سب کے سب تقریباً مر چکے تھے۔ غیر شعوری طور پر بلیک ہول کے حادثے کا اعادہ ہو چکا تھا۔ پینتالیس[۴۵] نعشوں کو کھینچ کر باہر نکالا گیا اور دوسرے باغیوں کی نعشوں کے ساتھ سب کو ایک مشترک گڑھے میں دفنا دیا گیا۔[۶۷]"

ملتان:

"قلعہ ملتان جو ۱۸۴۹ء میں مولراج کی لڑائی کے وقت سے سمار و خراب پڑا ہوا تھا فی الفور درست کرایا گیا اور قلعہ کو ذخیرہ سے بھر کر کمار کمی پلٹن بماتحتی کپتان ترانس صاحب اس میں اتاری گئی۔ ... حکام کو ھندوستانیوں کی طرف سے کمال اندیشہ تھا۔ انہیں دنوں میں ایک بڑا افسر ہندوستانی ۶۹ پلٹن کا اور دس سپاہی کورٹ مارشل کے حکم سے توپ سے اڑائے گئے۔ اس جرم پر کہ وہ اوروں کو بزدلی اور کمزوری کا طعنہ دے رہے تھے۔[۶۸]"

---

۶۷ - باری علیگ، کمپنی کی حکومت، لاہور، نیا ادارہ، ۱۹۶۹، ص ۳۸۷، ۳۸۸۔

۶۸ - تاریخ مخزن پنجاب ص ۵۰۸۔

گوگیرہ :

"۲۶ اگست کو قیدیوں نے جیل خانہ میں شورش کیا۔ کمار ملکی پلٹن والوں نے جوان کی حفاظت پر مامور تھے ان کی طرف گولیاں چلائیں ۔ ۔ ۔ جب اکیاون قیدی مارے گئے تو باقی ماندہ مطیع ہو گئے۔ احمد کھرل بھی اس وقت نظربندی سے بھاگ کر چلا گیا اور پھر ضمانت پر طلب ہو کر رہا ہوا۔ اور قوموں کے اور سردار بھی ضمانت پر رہا ہوئے۔ ۱۶ ستمبر کی رات کو ایک آدمی نے لیفٹیننٹ الفنسٹن صاحب کو آکر خبر دی کہ تمام سردار جو ضلع میں رہا کرتے تھے وہ سب گھروں کو بلا اجازت چلے گئے ہیں، اس ارادے پر کہ گھروں میں جا کر فساد برپا کریں ۔ ۔ ۔ برکلے صاحب اسسٹنٹ کمشنر واسطے گرفتاری احمد کھرل کے جو سرگروہ مفسدوں کا تھا روانہ ہوا، اور احمد کھرل کو دریا کے کنارے پہنچکر دریا کے دوسرے کنارے پر پایا۔ اس نے صاحب کو باآواز بلند کہا کہ میں نے اب سرکار انگریزی کی اطاعت چھوڑ کر شاہ دہلی کی تابعداری مان لی ہے۔
اس وقت ایک مولوی مسلمان مفسد گرفتار ہوا۔ زمینداروں کے مویشی بہت سے پکڑ لئے گئے اور جھامرہ ایک گاؤں جلا دیا گیا۔ ۔ ۔ اس مفسدہ میں چار قوموں کی زیادہ تر سرکشی اور بغاوت سرکار کے ساتھ ہوئی۔ پہلی قوم کاٹھیا، ان کا سردار محمد خاں کاٹھیا تھا۔ دوسری قوم کھرل جن کا سردار احمد خاں کھرل تھا اور وہ اس لڑائی میں قتل ہوا۔ تیسری قوم ستیانہ ان کا سردار بہاول خاں ستیانہ تھا، چوتھی قوم وٹو، ان کے سردار کا نام بخوبی معلوم نہیں ہوا۔"[۶۹]

جہلم :

"غدر کے وقت ضلع جہلم میں ایک ہندوستانی توپخانہ اور دو پلٹنیں نمبر ۱۴، ۳۹ تھی

۶۹- تاریخ مخزن پنجاب ص ۵۰۲، ۵۰۳۔

چونکہ گورہ فوج یہاں بالکل نہ تھی اس واسطے حکام کو ہندوستانیوں کی طرف سے سخت اندیشہ تھا اور چاہا کہ کسی طرح اس فوج کو یہاں سے نکالا جاوے اور یہ تجویزیں ہو کر پہلے ۳۹ نمبر کی پلٹن کو حکم ہوا کہ بغیر میگزین کے جہلم سے کوچ کر کر ڈیرہ اسماعیل کو چلے جاوے وہ پلٹن فی الفور میگزین چھوڑ کر ڈیرہ اسماعیل خاں کو چلی گئی. پھر توپخانہ کو حکم ہوا کہ تم یہاں سے کوچ کر کے لاہور جاؤ. وہ بتعمیل حکم لاہور پہونچے اور وہاں پہنچتے ہی توپیں ان سے چھینی گئیں اور بے ہتھیار کئے گئے باقی جہلم میں اب ۱۴ نمبر کے ہندوستانی رہ گئے۔

چیف کمشنر صاحب بہادر کا ارادہ ہوا کہ انکو بے ہتھیار کیا جاوے مگر جسقدر افسر اس پلٹن کے انگریز تھے وہ اس بات پر رضامند نہ تھے اور کہتے تھے کہ یہ پلٹن نمک حلال ہے۔ مگر حکام کو بسبب ۱۳۱ کے کہ وہ ہندوستانی تھے کمال اندیشہ دامن گیر تھا۔ پس اس پلٹن کو بھی کمزور کرنا منظور ہوا دو کمپنیاں تو اسمیں سے راولپنڈی بھیجی گئیں۔ اسطرح یہ پلٹن بھی جابجا کے ماموری سے بہت کم رہ گئی اور کل پلٹن میں پانسو آدمی رہ گیا۔

ساتویں جولائی کو سرکار کو اس پانسو آدمی سے ہتھیار لینے کا ارادہ ہوا۔ اور گورہ فوج معہ توپخانہ جو راولپنڈی سے وہاں گئی تھی اور ۱۴ نمبر سکھی پلٹن ہندوستانیوں کے ہتھیار لینے کے واسطے پریڈ کو مامور ہوئی۔ ہندوستانیوں نے جب دور سے اس فوج کو آتے دیکھا تو موت کو سامنے دیکھکر افسروں کی طرف گولیاں چلانی شروع کیں اور کمپنیاں توڑ کر لین میں گھس گئے۔ سرکاری فوج نے ان کا تعاقب کیا اور آپسمیں سخت لڑائی ہوئی۔ بہت سے انگریز مارے گئے۔ کرنیل الس صاحب کمان افسر پلٹن گورہ نمبر ۲۴ کمال زخمی ہوئے کپتان سپرنگ صاحب مارے گئے۔ ہندوستانی لین سے نکل کر ایک گاؤں میں جو پاس تھا جاکر پناہ گزین ہوئے اور لڑائی ہوتی رہی آخر گورہ فوج بسبب گرمی دھوپ کے جو جولائی کے مہینے میں ہوتی ہے بہت گھبرا گئی اور تین توپیں سیری ہتھیلی کے بالکل بیکار ہو گئیں اور ان کے

گوروں نے گاؤں کی کچی دیوار کو بھی جسمیں ہندوستانی تھے نہ گرایا۔ آخر بہت سی لڑائی اور گرمی اور دھوپ اور بھوک و پیاس کے باعث لشکر تھک گیا۔ چار بجے کرنیل جرد صاحب نے جنہوں نے کرنیل الیس صاحب کے مارے جانے پر اختیار لیا تھا حکم دیا کہ جس گاؤں میں ہندوستانی جا گھسے ہیں اس پر حملہ کیا جائے اگرچہ ہلہ ہوا مگر گلی کوچے گاؤں کے انگریزی لشکر کے واسطے خلل انداز تھے۔ توپوں کو گھروں کے نزدیک لاکر لگا دیا گیا مگر گولہ انداز اور انگریزی سوار ہندوستانیوں کی آتش فشانی سے قتل ہوئے اور سرکاری میگزین بھی کم ہو گیا۔ اس واسطے پیچھے ہٹنے کا بگل پھونکا گیا۔ اس وقت تین توپوں میں سے دو توپیں میدان سے واپس آئیں اور ایک توپ جو ہندوستانی غالب آکر لے گئے تھے اور اسکو سرکار کے سامنے چلا رہے تھے واپس نہ آئی اگرچہ لفٹین بینی صاحب اسسٹنٹ کمشنر نے بمدد تیس نمبر کے سواران پولیس کے توپ کے لینے کے واسطے بہت کوشش کی مگر ممکن نہ ہوا۔ الغرض دونوں فریق بڑی سخت لڑائی کے بعد اپنی اپنی فرودگاہ کو واپس ہوئے اور رات بھر جاگتے رہے۔ دوسری صبح کو معلوم ہوا کہ ہندوستانی بھاگ گئے ہیں صرف اس واسطے کہ ان کے پاس میگزین نہیں رہا تھا۔ بہت سے آدمی ان میں سے کشمیر چلے گئے مگر وہاں سے گرفتار ہو کر آئے اور بہت سپاہیوں کو پولیس والوں نے گرفتار کر کے حاضر کیا۔ وہ توپ بھی اڑائے گئے اور بہت سے ان میں سے دریا میں ڈوب گئے اور ایک سو چالیس لڑائی کے وقت میدان میں کام آئے الغرض کل پانسو آدمیوں میں سے چالیس آدمی گرفتاری و موت سے بچے رہے ان کی خبر نہ ملی کہ کہاں گئے [۷۰]"

سیالکوٹ :

"نویں جولائی ہندوستانی فوج کا مفسدہ سیالکوٹ میں ہوا اور ضلع کی حکومت بالکل معطل ہو گئی

---

۷۰ - تاریخ مخزن پنجاب ص ۵۰۳ تا ۵۰۵۔

سواران نے حملہ بریگیڈیر صاحب پر کیا اور ایک سوار نے ان کی پیٹھ پر گولی ماری۔ اگرچہ وہ اس وقت زخمی ہوئے مگر دوسرے روز اسی زخم کے صدمے سے مر گئے۔ ڈاکٹر گریہم صاحب سپرنٹنڈنٹ سارجن بگی میں اپنے لڑکے کو لے کر بھاگے جاتے تھے انکو بھی گولی لگی اور مارے گئے دوسرے ایک ڈاکٹر دوائی خانہ کا داروغہ بگی میں اپنے بچوں کیساتھ سوار چلا جاتا تھا وہ بھی گولی لگ کر مارا گیا اور ایک بچہ اس کے بچوں میں توپ کا گولہ لگ کر بس گیا۔ کپتان بشپ صاحب، بریگیڈیر میجر قلعہ کے سامنے گولی سے جان بحق تسلیم ہوئے۔ پادری ہنٹر صاحب اور اس کی میم اور معصوم بچہ ایک ہندوستانی سپاہی جیل خانہ کے ملازم کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ باقی انگریزوں نے چھاؤنی و ضلع سے بھاگ کر ایک قلعہ میں جو راجہ تیجا سنگھ سے علاقہ رکھتا تھا جاکر پناہ لی اور جان سے بچ گئے۔ الغرض مفسدوں نے تمام شہر اور چھاؤنی اور کچہریوں میں ایک حشر برپا کر دیا۔ جا بجا انگریزوں کی تلاش میں مصروف ہوئے اور جو مل گیا وہ قتل ہوا۔ پھر جیلخانہ کی طرف گئے اور تین سو سے زیادہ قیدی جو اسمیں تھے سب کو چھوڑ دیا اور کل خزانہ کلکٹری و آمدنی اسٹام وغیرہ لوٹ لیا۔ دفتر ضلع کا و کچہریوں کے مکانات جلا دیئے۔ میگزین کو آگ لگا کر اڑا دیا۔ صبح سے دوپہر تک مفسدوں نے خوب غارت کی۔ بعد دوپہر کے اپنے ہندوستانی افسروں کو ساتھ لیکر اور چھکڑوں پر اسباب لاد کر گورداسپور کو روانہ ہوئے[۱]۔"

تحریک ختم ہونے پر سیالکوٹ کے مجاہدین کے ساتھ جو سلوک ہوا اسے بھی ایک نظر دیکھ لیجیے۔

کپتان کرب صاحب ڈپٹی کمشنر اور لارنس صاحب افسر پولیس سیالکوٹ کے مقرر ہوئے انھوں نے سیالکوٹ میں جاکر پہلے دو بڑے پولیس کے افسروں کو جنھوں نے بیوفائی کی تھی پھانسی دیا

۱۔ "تاریخ مخزن پنجاب ص ۵۰۲، ۵۰۳

جیل خانے کے دو اور اسیروں نے بھی موت کی سزا پائی اور بھی بڑے بڑے مفسد گرفتار ہو کر پھانسی ملے۔ سات ہزار روپیہ جرمانہ ان زمینداروں پر جنہوں نے غدر کے وقت دست اندازی کی تھی قرار پایا ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۳۹ کس مفسد جو جموں کے پہاڑ کی طرف بھاگ گئے تھے وہاں سے گرفتار ہو کر آئے اور توپ کے سامنے اڑائے گئے[۷۲]۔

پنجاب میں جنگ آزادی کی تحریک پر ابھی تک کام نہیں ہوا۔ انگریز نواز تاریخیں جن میں اتفاق سے سید محمد لطیف کی مشہور تالیف بھی شامل ہے۔ پنجاب کی اصلی تصویر پیش نہیں کرتیں۔ خود مفتی غلام سرور کی تاریخ بھی انگریزی دور میں لکھی گئی۔ اس کا انداز بھی بے لاگ اور آزادانہ نہیں لیکن چونکہ یہ واقعات مفتی کے چشم دید ہیں۔ لہٰذا بین السطور میں حقیقت کو تلاش کرنا مشکل نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ مولوی احمد بخش یکدل کی ۱۸۵۷ء کے متعلق ڈائری تلف کر دی گئی۔ ورنہ پنجاب اور ۱۸۵۷ء کے صحیح واقعات ایک بے طرف اور غیر متعصب مورخ کے وسیلے سے ہم تک پہنچ جاتے۔ جنگ آزادی کے ختم ہونے پر اہل پنجاب کو انگریزوں نے جو ذو معنی خراج عقیدت پیش کئے، ان سے ایک خاص طبقے کو فائدہ ضرور ہوا۔ لیکن بطور مجموعی پنجاب کو اپنی ملی تاریخ میں اپنے صحیح اور مستحق مقام کے ساتھ شامل ہونے کا موقع نہ مل سکا۔

۱۸۵۷ء کی تحریک ختم ہونے کے بعد انگریزی سیاست اور حکمرانی کا جھنڈا تمام ملک میں لہرانے لگا۔ اب تمام ہندوستان بلا شرکت غیرے انگریز کی ملکیت تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی تحریک کا رد عمل بھی آئندہ ملکی سیاست پر اثر انداز نظر آتا ہے۔ پنجاب میں اس کے نتائج واضح دکھائی دیتے ہیں ہر میدان میں خواہ ملکی سیاست ہو یا اجتماعی زندگی، ادبی تخلیقی کارنامے ہوں یا فکری اور دینی

۷۲۔ تاریخ مخزن پنجاب ص: ۵۰۳۔

تحریکات، پنجاب اب بالکل نئے زاویہ نگاہ سے زندگی کی راہ پر گامزن ہے۔

جنگِ آزادی میں انگریزوں نے فتح حاصل کی۔ لیکن اس کامیابی نے انگریزی سیاست کو ایک نیا شعور بھی دیا جس سے ۱۸۵۷ء سے پہلے انگریز یا تو بے بہرہ تھا اور یا بے اعتنا تھا۔ وہ یہ کہ ملک گیری میں رعایا یا عوام کی رضامندی کا بھی اہم حصہ ہے۔ نیز ہندوستان پر حکومت اس قدر آسان نہیں کہ رعایا کی امداد کے بغیر حکمران اپنے فرائض سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہو سکیں دوسری طرف جنگِ آزادی نے سیاسی اعتبار سے اہلِ ہند کو بیدار کر دیا تھا۔ انگریزی حکومت سے مفاہمت یا بقول سرسید اطاعت اب اندھا دھند یا جبری نہیں تھی۔ بلکہ ملکی سیاست میں خود حصہ لیتے ہوئے اسے سمجھنے کی پوری کوشش بھی اس میں شامل تھی۔ نئی صورتِ حال انگریزی قدرت اور عوامی ردِ عمل کے درمیان افہام و تفہیم کا ایک پل تھی۔ ہندوستان کے مسلمان مفکرین جن کے سرگردہ سرسید احمد خاں اور مولوی محرم علی چشتی تھے۔ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہو چکے تھے۔ لہذا تہذیب الاخلاق یا رفیق ہند کا رویہ انگریز نواز نہیں بلکہ دوستانہ فضا میں ایک دوسرے کو سمجھنے کی قابلِ قدر کوششیں ہیں۔

۱۸۵۷ء کے فوری بعد ملک بھر میں ترقیاتی سکیموں کا دور شروع ہو گیا۔ سکھ دور میں پنجاب کے تعلیمی، انتظامی، سیاسی اور امنیتی شعبوں میں جو نقائص تھے انہیں زیرِ مطالعہ قرار دے کر دور کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ ۱۸۵۸ء میں لارڈ کیننگ گورنر جنرل ہند مقرر ہوا اور پنجاب کے چیف کمشنر لارڈ لارنس کو لیفٹیننٹ گورنر پنجاب مقرر کیا گیا۔ مورخین کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ لارڈ لارنس ایک مردِ مسلمان نواز اور پنجاب دوست تھا۔ اسی سال دہلی اور حصار کے ڈویژن بھی پنجاب میں شامل کر دیے گئے۔ پنجاب بھر میں سر جان لارنس کے لیفٹیننٹ گورنر ہونے پر خوشی کا اظہار کیا گیا۔ شعراء نے تاریخیں کہیں۔ دیوان امرناتھ اکبری کی کہی ہوئی تاریخ بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔

تاریخ لیفٹیننٹ گورنری سر جان لارنس صاحب

چون صاحب جان سلطنت را | شد خلعت سروری مبارک
گویند برای ذات اقدس | هر گونه خوش اختری مبارک
شد از مددِ جناب عیسیٰ | هر خوبی و بهتری مبارک
بر ذات گرامیش همیشہ | الطاف سکندری مبارک

عیسیٰ شدہ شامل و همیں گفت
لیفٹیننٹ گورنری مبارک[73]
۱۸۵۸

لارڈ لارنس کی عام پالیسی دانشمندانہ تھی وہ تمام فرقوں کی مذہبی آزادی کا قائل تھا۔ اس نے جامع مسجد دہلی کو مسمار کرنے کی مخالفت کی ہے۔ اور مسلمانوں کی دینی خود مختاری کو تحفظ دیا۔ پنجاب میں مسلمانوں کو سکھوں نے جس مذہبی سیاسی اور سوشل آزادی سے محروم کیا ہوا تھا اسے از سرِ نو بحال کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۵۹ء کے آخر میں جان لارنس خرابیٔ صحت کے باعث مستعفی ہوئے اور سر رابرٹ منٹگمری نے لیفٹیننٹ گورنر کا چارج حاصل کیا۔ ۶۱-۱۸۶۰ء میں پنجاب کو ہولناک قحط کا سامنا ہوا۔ ۱۸۶۲ء میں لارڈ کیننگ کی بجائے لارڈ ایلجن وائسرائے ہند مقرر ہوئے لیکن عمر نے وفا نہ کی اور ۱۸۶۳ء میں انتقال ہو گیا۔ ۱۸۶۴ء میں رابرٹ منٹگمری نے لاہور میں دستی صنائع اور فنون لطیفہ کی نمائش کا افتتاح کیا۔ اسی طرح علوم و فنون کے دوسرے شعبوں بالخصوص ادبیات کی طرف بھی انگریزی حکومت نے توجہ کی۔ مقامی ادیبوں اور اداروں نے بالخصوص انجمن پنجاب نے کہ ۱۸۶۴ء میں قائم ہوئی تھی، اردو ادب کے فروغ میں بڑا حصہ لیا۔ اس کا تذکرہ اگلے باب میں بہ تفصیل کیا جا رہا ہے۔

۷۳- دیوان اکبری، خطی (عکسی نقل) کراچی، نیشنل میوزیم۔

۷۴. History of the Punjab. P. 582.

تیسرا باب

سنہ ۱۸۶۴ء سے سنہ ۱۸۸۱ء تک

تیسرا باب :

سنہ ۱۸۶۴ء سے سنہ ۱۸۸۱ء

جنوری ۱۸۶۴ء میں لارڈ ایلجن کے بجائے لارڈ لارنس کا گورنر ہند کے طور پر تقرر ہوا یعنی لارنس چھ سال کے وقفے کے بعد دوبارہ ہندوستان میں آئے اور ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۸۶۴ء کو لاہور میں بہت بڑا دربار منعقد کیا۔

۱۸۶۵ میں رابرٹ منٹگمری مستعفی ہو گئے اور ان کے بجائے سر ڈونلڈ میکلوڈ، لیفٹیننٹ گورنر پنجاب مقرر ہوئے۔ میکلوڈ کو غالب نے اپنے قصیدے کے ذریعے ادب اردو کا ایک اہم نام بنا دیا ہے۔

کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام
فرمانروائے کشورِ پنجاب کو سلام
حق گوئی و حق پرست و حق اندیش و حق شناس
نواب مستطاب امیر شہ احتشام
جم رتبہ میکلوڈ بہادر کہ وقت رزم
ترک فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لیں حسام
جس بزم میں کہ ہو انھیں آہنگ مے کشی
واں آسمان شیشہ بنے آفتاب جام[1]

سر ڈونلڈ میکلوڈ مئی ۱۸۱۰ء میں فورٹ ولیم کلکتہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس لحاظ سے چونکہ اس کا شعور ہندوستانی فضا میں پختہ ہوا تھا لہٰذا اہلِ ہند کی زندگی سے دلچسپی اس کے

۱۔ اسداللہ خاں غالب۔ دیوانِ غالب، مرتبہ گوہر نوشاہی، لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز ۱۹۶۹، ص ۱۸۹

میں شامل تھی۔ میکلوڈ ۱۸۷۲ء میں تقریباً ۶۳ برس کی عمر میں فوت ہوا۔ اس نے ۱۸۷۰ء میں غالباً خرابیٔ صحت کی بنا پر استعفیٰ دے دیا تھا۔ پنجاب کے گورنر کی حیثیت سے اس کی حکومت کی مدت صرف پانچ سال ہے۔ لیکن اس قلیل عرصے میں پنجاب نے مختلف شعبوں میں جو ترقی کی اُسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ سر ڈونلڈ میکلوڈ کے مستعفی ہونے پر سر ہنری میرین ڈیورانڈ لیفٹیننٹ گورنر مقرر ہوئے ان کے دورِ حکومت کا اہم واقعہ کوکوں کی بغاوت کے علاوہ پرنس آف ویلز کی لاہور میں آمد ہے۔ آئندہ باب میں اس کا مفصل ذکر بطور تمہید آئے گا۔ اس دور میں جن اہم امور کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے ان میں درج ذیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ تاریخ پنجاب پر تحقیقی کام کی سرپرستی اور تشویق۔

۲۔ مذہبی خیالات کی آزادی۔ ہر مذہب، فرقے اور عقیدے کو نشر و اشاعت کا حق دیا گیا۔ ہر مذہب کے حقوق کے تحفظ کیلئے لائحۂ عمل وضع ہوا۔

۳۔ پنجاب میں تعلیم کی ترقی کی کوششیں عمل میں آئیں۔

۴۔ ادبی اور اصلاحی انجمنوں کا قیام۔

۵۔ پنجاب ادب اردو کی ترویج و ترقی کا ہندوستان بھر میں سب سے اہم مرکز قرار پایا۔

۶۔ پنجاب میں اردو کو قومی زبان قرار دینے اور ذریعہ تعلیم بنانے پر زور۔

ان موضوعات پر مفصل بحث دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

تاریخِ پنجاب پر تحقیقی کام :

پنجاب پر قبضہ کرنے کے ساتھ ہی انگریزوں نے پنجاب شناسی کی طرف خاص توجہ کی۔ انگریزوں کو پنجاب کی تاریخ سے اس لئے بھی زیادہ دلچسپی تھی کہ سکھ دور اور مخصوصاً رنجیت سنگھ کے چالیس سالہ دور حکومت میں پنجاب کے بارے میں وسیع معلومات حاصل کرنے کے امکانات بہت کم تھے۔ دوسرے یہ کہ سکھ دور میں پنجاب میں وارد ہونے والے سیاحوں کی تحریریں اوّل

تو مقدار میں کم تھیں اور دوسرے اشاعت میں نہ آنے کیوجہ سے محققین کی دسترس سے باہر تھیں۔
یہی سبب ہے کہ ۱۸۴۹ء کے فوراً بعد انگریزوں نے پنجاب کے بارے میں وسیع پیمانے پر معلومات جمع
کرنی شروع کر دی تھیں۔ مورخین کی سرپرستی کی گئی اور تاریخ پنجاب یا اہلِ پنجاب پر اچھے
علمی کاموں کا معقول انعامات سے معاوضہ دیا گیا۔

پچھلے باب میں بیان کیا گیا تھا کہ رنجیت سنگھ کا عہدِ حکومت تاریخ نویسی کا دور تھا
انگریزوں نے اس زمانے کے مورخین سے اپنے مطلب کی معلومات فراہم کرنے کیلئے استفادہ کیا۔
اس سلسلے میں انگریزوں کا رویّہ سکھ دور کے ممتاز مورخ مولوی احمد بخش یکدل کی ایک
روایت سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ یکدل انگریزوں کے بارے میں بہت برے خیالات رکھتے
تھے۔ لیکن ایک روز اپنے دوست عبداللہ مترجم کے گھر ایک انگریز آفیسر سے ان کی ملاقات
ہو گئی۔ انگریز افسر مولوی صاحب سے جس اخلاق اور احترام سے پیش آیا اس کا نتیجہ نہ صرف
یہ ہوا کہ مولوی صاحب نے بعض انگریزوں کو اچھا انسان کہنا شروع کیا بلکہ افسر موصوف کے
سوالات پر پنجاب کے بعض حصوں پر اپنی تاریخی معلومات کے مطابق مفصل گفتگو بھی کی۔
اس ملاقات کا بیان یکدل کی زبانی سنیئے:

"دیروز[2] ہمراہ حافظ ایزد بخش روانۂ مکان میر عبداللہ شاہ مترجم کہ در دفتر
انگریزی گرامی جناب است شدہ رفتیم و رسیدیم۔ صاحب بہادر کہ نام آں معلوم نیست
امروز معلوم کردہ خواہم نوشت، نشستہ بودند، بر کرسی ہا کہ مرسوم این گروہ
است و باز بسیار خلق و محبت کرد۔ احوال رسول پور اما نگرہ تمام ظاہر

---

۲ - مارچ ۱۸۴۸ء غالباً حاشیہ از مولوی حامد علی چشتی کیونکہ یکدل یا محض قمری تاریخ لکھتے ہیں
یا پہلے قمری اور پھر انگریزی تاریخ درج کرتے ہیں۔

کردم ...... و بندہ وسیلہ میر عبداللہ مترجم محضور صاحب بہادر گزرانیدہ مشار الیہ بسیار راضی شدہ و صاحب زبان ہندی از میر مذکوری آموزد و میر انگریزی زبان میدانند، او را می فہمانند۔ و صاحب بہادر با فقیر طریق محبت و سلوک کردہ[۳]"

اس ہمکاری اور معلومات کی فراہمی میں جن مصنفین نے حصہ لیا ان میں غلام محی الدین بوٹے شاہ، مفتی علی الدین بن مفتی خیر الدین، مولوی نور احمد چشتی، مفتی تاج الدین مفتی غلام سرور لاہوری، امین چند اور کنہیا لعل ہندی قابل ذکر ہیں۔

بوٹے شاہ نے ۱۸۴۲ء کو لدھیانہ میں کیپٹن مرے ریزیڈنٹ کی فرمائش پر فارسی زبان میں تاریخ پنجاب لکھی۔ اور مفتی علی الدین نے اپنی معرکہ آرا تصنیف عبرت نامہ ۱۸۵۴ء میں مکمل کر کے چارلس ریکس کمشنر لاہور کو پیش کی۔ یہ بھی فارسی زبان میں ہے۔ مولوی نور احمد چشتی نے تحقیقات چشتی اور یادگار چشتی، مفتی تاج الدین نے حالات ضلع لاہور مفتی غلام سرور نے تاریخ مخزن پنجاب۔ امین چند نے سفرنامہ پنجاب لکھ کر اردو کے تاریخی ادب کو مالا مال کیا ہے۔ ان میں سے یادگار چشتی اور سفرنامہ امین چند کا ذکر پچھلے باب میں کیا جا چکا ہے۔ یہاں باقی تالیفات کا مختصر تعارف درج کیا جاتا ہے

تحقیقات چشتی:

مولوی نور احمد چشتی سبب تالیف میں لکھتے ہیں:

"اب ان ایام فرصت انجام میں جناب خداوند نعمت آقائے نامدار عالی وقار، قدردان اہل علم و ہنر، مجموعہ اخلاق، برگزیدہ آفاق، صاحب فیض عمیم

۳- بیاض میکیل شمارہ ۱۳۔

جناب مسٹر ولیم گولڈ سٹیریم عالی جاہ بہادر دام اقبالہٗ اسسٹنٹ کمشنر
نے اس کمترین کو حکم دیا کہ حالات عمارات اور مزارات و مقابر و مساجد
نواح لاہور مفصل تحریر کروں[۴]۔

اگرچہ یہ کام نہایت دشوار تھا۔ کیونکہ صدہا سال کے حالات بہم پہنچانے
خیلی مشکل تھے اور کمترین کا یہ حوصلہ نہ تھا کہ اس امر اہم کو شروع کرے
مگر صاحب ممدوح کے عنایات نے مجھکو یہ صلاح نہ دی کہ انکار کروں،
علاوہ بریں ارادہ صاحب ممدوح الوصف کا بھی محض واسطے رفاہ خاص
و عام کے تھا کہ اس سے ہر ایک متنفس کو آگاہی ہو جاوے۔ اس واسطے
فدوی نے باہزار خوشی اس کام کے انجام کے واسطے کمر ہمت باندھی[۵]۔

تحقیقات چشتی کی تالیف ۱۸۶۴ء میں مکمل ہوئی۔ مادہ ہای تاریخ مصنف کے علاوہ
ان کے نامور معاصرین مفتی غلام سرور لاہوری اور مولوی غلام فرید نے موزوں کئے۔ کتاب کی اشاعت
۱۸۶۷ء میں ہوئی۔ لیکن اس سے تین سال پہلے یعنی ۱۸۶۴ء میں جیسے کہ پہلے بیان ہوا۔ مولوی نور احمد چشتی
ہیضے کے مرض سے وفات پا چکے تھے۔ مصنف نے کتاب کو چھپا ہوا نہیں دیکھا۔ اور ان کے دوستوں
اور عزیزوں نے خاتمۃ الطبع کی تاریخیں لکھیں۔ ان میں مصنف کے برادر حقیقی مولوی محمد علی پردل
مصنف کے غالباً برادر نسبتی بہادر شاہ بن سید چراغ شاہ سبزواری اور مصنف کے دوست
مفتی غلام سرور لاہوری کے قطعات تاریخ اور مصنف کے ماموں مولوی فضل دین صحاف کی
نثری عبارت شامل کتاب ہیں۔ کتاب کی اشاعت مطبع کوہ نور لاہور کے اہتمام سے ہوئی تھی۔

۴۔ تحقیقات چشتی مطبوعہ کوہ نور۔ ص ۲۱

۵۔ ایضاً طبع لاہور ۱۹۶۴ء۔ ص ۲۷

مولوی نور احمد کا تخلص چشتی تھا۔ اردو کے صاحبِ طرز اور صاحبِ دیوان شاعر تھے تحقیقات کی نثر میں بھی ان کا شعری مزاج موجود ہے۔ بعض مقامات پر تاریخی واقعات کا بیان شاعرانہ اسلوب کی غمازی کرتا ہے۔ حضرت مادھولال حسین کے عرس کے بارے میں چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

"چنانچہ آج بتاریخ سلخ جنوری بروز سہ شنبہ حضرت کا عرس مبارک بتقریب بسنت تھا اور یہ کمترین بھی آستانہ بوسی کے واسطے مشرف ہوا تھا۔ کیا بیان کروں کہ کس قدر انبوہ یکہ و بگھی و ہاتھی و گھوڑا کا تھا۔ دہلی دروازے سے تا بہ شالا مار برابر خلق اللہ تھی اور تِل پھینکا زمین پر نہ گرتا تھا۔"[6]

حکیم علم الدین کے ہاتھوں ملکہ نور جہاں کے معالجے کی یوں تصویر کھینچی ہے:

"علم الدین نے شکریہ ادا کر کے عرض کی: کہ ایک دالان میں ایک ایک بالشت ریگ بیابان مصفا بچھائی جاوے۔ کمترین بعد نماز ظہر آستان بوس در دولت ہوگا۔ خدام نے ویسا ہی کیا۔ حکیم علم الدین نے دوسرے روز بعد نماز شافیٔ مطلق کی جناب میں بصد خشوع و خضوع مناجات کر کے مدد چاہی اور اقرار کیا کہ اگر میرے معالجے سے بیگم صاحبہ کو شفا حاصل ہو جاوے جو جو کچھ حق الخدمت مجھے عطا ہوا تعمیر مسجد میں صرف کروں گا۔ بعد ازاں قلعہ معلی میں شرف یاب ہو کر التماس کیا کہ جناب بیگم صاحبہ بلا تکلف اس مکان ریگ گسترده میں چند قدم ٹہل کر پردہ میں چلی جاویں۔ جب یہ معاملہ ہو چکا تو حکیم علم الدین نے وہاں جا کر توکلت اللہ کہہ کر کبھی نقش رگ پا میں اس وضع سے مخفی کر کے رکھی کہ باہر سے بالکل معلوم نہ ہوتی تھی۔ بعدہٗ عرض پیرا ہوا کہ بیگم صاحبہ

۶۔ تحقیقات چشتی ص: ۱۲۸

انہی پیروں طابق النعل بالنعل اندر تشریف لے جاویں اور اسی طرح ٹہل کر مکان جانے لگی تو علی الاعلان سب حرموں کے روبرو وعدہ کیا کہ اگر جناب باری شافی مطلق عز اسمہ اس طبیب کے دست شفا سے مجھے شفائے عاجل اور صحت کامل عطا کرے تو تمام زیور جو اس وقت میرے زیب تن ہے شکریہ میں اس طبیب کو عطا کروں گی ۔ یہ کہتے ہوئے بیگم صاحبہ حسب الایما اس کے اسی طرح بہ خرم تمام اس مکان میں تشریف لے گیئں ۔ جب نشتر والے نقش پا پر پاؤں رکھا تو وہ کارگر ہوئی ۔ ذرا درد سی محسوس ہوئی اور چند قطرے خون فاسد کے نکل گئے تو نزاکت کی راہ سے آنے والے کی صدا نکلی حضور یہ شعر فرطِ محبت سے زبان پر لائے :

خون فاسد بہ نشتر فصّاد   دم بدم از عروق پا کم باد

فی الفور مرض میں گونہ آرام ہو گیا ۔ حضور نے بہت سا انعام عطا فرما کر عہدہ امارت شفاخانہ جات سے سرفراز کیا ۔ مقویات استعمال ہونے لگیں۔"[7]

مذہبی آزادی اور مذہبی ادب :

اردو زبان میں مذہبی ادب کی کمی نہیں ۔ پنجاب کے اہلِ قلم ہر دور میں مذہبی مسائل پر لکھتے رہے ہیں ۔ لیکن انیسویں صدی کے نصف آخر میں مذہبی ادب ایک خاص زاویے سے وجود میں آتا ہے ۔ یہ نقطۂ نظر اسلام پر مسیحیت کے حملے سے پیدا ہوتا ہے ۔

ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں مغلیہ دور سے شروع ہو جاتی ہیں ۔ ان کی مفصل روداد امداد صابری صاحب نے اپنی مستند کتاب فرنگیوں کا جال میں بیان کر دی ہے ۔

---

۷ ۔ تحقیقات چشتی   ص ۱۰۰۱ تا ۱۰۰۲

پنجاب میں انگریزوں کے قبضے سے پہلے مشنری سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ سکھ دور سے پہلے پنجاب کے کسی علاقے میں مشنری ادارے کا واضح سراغ نہیں ملتا۔ سکھ دور کے پنجاب میں بھی عیسائی مشنری زیادہ با اثر نظر نہیں آتے۔ اس دور کا پنجاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔ انگریزوں کے زیرِ حفاظت ریاستیں اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وسیع سلطنت۔ عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں ستلج پار ریاستوں میں دکھائی دیتی ہیں لیکن مہاراجہ کے پنجاب میں اس کا سراغ بہت کم ملتا ہے۔ اس کی وجہ شاید مہاراجہ کی مذہبی پالیسی ہو۔ پنجاب کے اس حصے میں عیسائیوں کو اپنی تخریب کارانہ سرگرمیاں شروع کرنے کا موقع ۱۸۴۶ء میں ملتا ہے۔ ویسے بھی انگریزی دور کے مشنریوں کی سرگرمیاں ہندوستان میں انیسویں صدی میں ہی شروع ہوتی ہیں۔ ایک اور نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ انگریزی دور سے پہلے کے مشنری اپنے خلافِ اسلام کارروائیوں کے باوجود اسلام اور ارکانِ اسلام پر اس قسم کے گستاخانہ حملے روا نہیں سمجھتے تھے۔ اس قسم کے حملے انگریز دور کے مشنری عیسائیوں نے انیسویں صدی میں شروع کئے۔ دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ انگریزی دور سے قبل عیسائی مشنریوں کی کارروائیوں کے عمل یا ردِعمل کے نتیجے میں اردو ادب کسی ایسی واضح شکل میں دکھائی نہیں دیتا۔ جسے مذہبی یا دینی مباحثوں کا ادب قرار دیا جا سکے۔

انگریزی دور میں سب سے پہلا عیسائی پادری جس نے مسلمانوں کی مذہبی غیرت کو للکارا ڈاکٹر سی۔ جی فنڈر تھا۔ ڈاکٹر فنڈر کے اعمال کو انگریز حکومت کی شہ حاصل تھی۔ یہ ۱۸۳۷ء میں کلکتہ پہنچے اور چرچ مشنری سوسائٹی کے کارمند کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ ۱۸۴۰ء میں وہ چرچ مشنری سوسائٹی کی طرف سے آگرہ بھیج دیئے گئے۔ پادری فنڈر ۱۸۳۳ء میں جب اپنی مسافرت کے دوران تبریز سے گذر رہے تھے

انہوں نے اپنی ۱۸۲۹ء میں لکھی ہوئی کتاب "میزان الحق" کا ایک ایرانی منشی کی مدد سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ کام دھوکے سے لیا گیا تھا۔ جب منشی کو اس کے مطالب کا احساس ہوا تو اس نے مدد کرنے پر افسوس کا اظہار کیا۔ ۱۸۴۰ء سے پہلے فنڈر نے اردو زبان سیکھ کر "میزان الحق" کو اردو میں مکمل کر لیا۔ فنڈر کی اس کتاب کا فارسی اڈیشن اس کے ہندوستان پہنچنے پر بمبئی اور کلکتہ سے شائع ہوا اور ہندوستان کے بعض اہم حصوں میں اسکو منتشر کر دیا گیا۔

۱۸۴۵ میں ہندوستان کے علماء نے اس فتنے کا مجاہدانہ سدِ باب کیا اور تقریباً ملک کے ہر حصے میں جہاں کتاب پہنچی تھی علماء کی طرف سے ناراضی کا اظہار کیا گیا۔ ۱۸۴۵ میں آگرہ کے ایک سرکاری افسر مولانا آل حسین نے میزان الحق کے جواب میں کتاب استفسار لکھی۔ اسی طرح لکھنؤ سے ایک عالم دین نے فنڈر کی ایک دوسری کتاب مفتاح الاسرار کے جواب میں کشف الاستار لکھی جس کا جواب فنڈر نے حل الاشکال کے نام سے دیا۔ اس کا جواب مولانا محی الدین احمد آبادی نے لکھا[8]۔ ۱۸۵۴ء میں فنڈر کا آگرہ میں مولانا رحمت علی سے مناظرہ ہوا[9]۔ اور یوں عیسائیت اور اسلام کے درمیان نہ صرف فکری مباحث اور مناظروں کا دور شروع ہوا بلکہ اس کے ردِ عمل میں اردو کو مذہبی ادب کا ایک قابلِ توجہ ذخیرہ بھی دستیاب ہوا۔

پنجاب میں جن عیسائی مشنریوں نے اپنی سرگرمیوں کا جال پھیلایا ان میں

۸۔ امداد صابری، فرنگیوں کا جال، دہلی، چوڑی والاں، ۱۹۴۹ء، ص ۹۶

۹۔ تفصیل کیلئے دیکھئے آثار رحمت از مولانا امداد صابری، دہلی، یونین پریس۔

پادری لیفرائے، ٹامس والپی فرینچ، چارلس ولیم فورمین ــــ پادری عماد الدین، ایچ ڈبلیو گارڈن، ٹامس ہنٹر، ڈاکٹر جے ایم، آر ینگ، پادری رام چندر پٹیالوی، ٹھاکر داس اور پادری طالب الدین کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے پادری عماد الدین کی تصانیف نے پنجاب کے اندر بطورِ خصوصی مذہبی دل آزاری کا سامان مہیا کیا۔ ان ناموں کیساتھ پادری رجب علی کا نام بھی قابلِ ذکر ہے کیونکہ یہ مذہبی موضوعات کے علاوہ ادبی، لسانی اور ملکی موضوعات پر بھی قلم اٹھاتے تھے۔ ان کے مقالات انیسویں صدی کے دوسرے اخبارات کے علاوہ مشہور اخبار رفیقِ ہند میں بھی شائع ہوئے۔ پادری عماد الدین کی کتابوں کی فہرست طویل ہے لیکن جن کتابوں سے مذہبی مباحث اور مناظروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان میں تاریخِ محمدی اور من انا وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

ہندوستان کے مختلف حصوں میں ردِ نصاریٰ کے سلسلے میں علمائے اسلام نے جو مجاہدانہ کوششیں کیں ان کا تذکرہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ لیکن صرف پنجاب میں جن اہم دینی کوششوں نے مخالفت کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روکا انکا بطورِ اجمال تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔

ردِ نصاریٰ کی کوششوں میں سرزمینِ پنجاب کے تمام علماء سرگرم نظر آتے ہیں لیکن جن چند ہستیوں کو مذہبی مناظروں کی تاریخ فراموش نہیں کر سکتی ان میں حافظ ولی اللہ لاہوری، مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی، مولانا فقیر محمد جہلمی، مولانا فیروز الدین ڈسکوی اور مولوی فتح محمد قصوری کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا حالی کی شخصیت اور سوانح محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ آپ نے ردِ نصاریٰ میں اپنی مشہور تصنیف تریاقِ مسموم اور تاریخِ محمدی پر منصفانہ رائے لکھی یہ دونوں کتابیں پادری عماد الدین کی تاریخِ محمدی اور تحقیق الایمان کے جواب ہیں۔ حافظ ولی اللہ نابینا تھے اور سکھ دور نیز انگریزوں کے ابتدائی دورِ حکومت میں پنجاب کے ممتاز ترین علماء میں شمار

ہوتے تھے ۔ کنہیالعل ہندی نے مشہور تاریخ " تاریخ لاہور میں انکا ذکر درج ذیل الفاظ میں کیا ہے ۔

"یہ ایک شخص عالم معتبر لاہور کے علماء میں سے تھا ۔ انگریزی عہد میں اس نے علم پڑھا اور ترقی پائی کہ سب سے گوئے سبقت لے گیا ۔ مناظرے کے علم میں اس کو یہ استعداد تھی کہ بڑے بڑے پادری عیسائی اس کے روبرو بول نہیں سکتے تھے ۔ وعظ نہایت عمدہ کہتا تھا ۔ باوجود نابینائی کے خدا نے دل کی روشنی اور عقل کا جوہر اسکو ایسا دیا تھا کہ سب کتابیں اسکو نوکِ زبان تھیں ۔ حکام وقت اس کی عزت کرتے تھے اور عدالت سے فتاوی اسی سے طلب کئے جاتے تھے ۔"[10]

کنہیالعل نے تاریخ لاہور کی تالیف کے وقت یعنی ۱۸۸۲ء میں لکھا ہے کہ حافظ ولی اللہ چار سال پہلے فوت ہو چکے ہیں ۔ اس اعتبار سے حافظ ولی اللہ ۱۸۷۸ء میں فوت ہوئے ۔

ردِ نصاریٰ میں حافظ ولی اللہ کی جو کتاب اپنے دور میں شہرت کی اہم منزلیں طے کر چکی تھی اس کا نام صیانۃ الانسان عن وساوس الشیطان ہے ۔ اس کتاب کے علاوہ حافظ ولی اللہ نے ۱۸۶۷ء میں امرتسر میں پادری عماد الدین کیساتھ تحریری مناظرہ کیا ۔ یہ مناظرہ "مباحثۂ دینی" کے نام سے کتابی شکل میں مرتب ہوا اور ۱۸۷۱ء میں مولوی فقیر محمد جہلمی نے اس کام کو تکملہ اور حواشی لکھ کر اپنے اہتمام سے مطبع مصطفائی لاہور سے شائع کیا ۔ اس کا ذکر مولوی فقیر محمد جہلمی کی مشہور تالیف حدائق الحنفیہ کے خاتمے میں موجود ہے ۔ مباحثۂ دینی کا پہلا ایڈیشن ہمارے پیشِ نظر ہے ۔ طباعت کی دو تاریخیں مفتی غلام سرور لاہوری نے موزوں کی ہیں ۔ حواشی پر جابجا مولوی فقیر محمد جہلمی کے وضاحتی نوٹ شائع ہوئے ہیں ۔ حافظ ولی اللہ کا انداز بیان عالمانہ ہے ۔ انکی اردو باوجود زبانی املا کے نہایت سلیس اور مربوط ہے ۔ بطور مثال چند جملے درج ذیل ہیں ۔

---

۱۰ ۔ تاریخ لاہور ص ۷۵ ۔

"قرآن شریف میں اخبار غیب بہت سے بیان ہوئے ہیں اور وقوع ان کا مطابق قرآن شریف کے ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ تفصیل اخبار غیب کی کتاب تصدیق المسیح میں مفصل موجود ہے۔ طالبان حق اسے دیکھ لیں۔

قرآن شریف میں اگلے انبیاء کی خبریں مفصل درج ہیں حالانکہ آنحضرتؐ نے عمر بھر کسی شخص سے علم حاصل نہیں کیا۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ ضرور یہ تعلیم الٰہی ہے۔"[۱۱]

حافظ ولی اللہ سے متاثر ہو کر جن علماء نے رد نصاریٰ میں کتابیں لکھیں ان میں پہلا شمار فقیر محمد جہلمی کا ہے۔ ان کی مستقل کتابوں میں سب سے اہم کتاب "زبدۃ الاقاویل فی ترجیح القرآن علی الاناجیل" ہے۔ یہ کتاب پادری فنڈر کی تالیف حل الاشکال سے متاثر ہو کر اس کے جواب میں لکھی گئی۔ اور ضمنی مباحث میں پادری عماد الدین اور پادری ٹھاکر داس وغیرہ کے قرآن پر اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ کتاب مصنف کے ذاتی مطبع سراج المطالع جہلم سے شائع ہوئی۔ مولوی فقیر محمد جہلمی کے مفصل حالات ان کے تذکرے حدائق الحنفیہ میں موجود ہیں۔ مولوی فقیر محمد کے والد کا نام حافظ محمد سفارش تھا۔

مولوی فقیر محمد مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی کے شاگرد تھے۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ ایک اخبار بھی جہلم سے نکالتے تھے۔ اس کا نام سراج الاخبار تھا۔

زبدۃ الاقاویل کی زبان اردو کے مذہبی ادب میں اسلوب نثر کے اعتبار سے قابل توجہ ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

۱۱۔ حافظ ولی اللہ، مباحث دینی، لاہور، مصطفائی، ۱۸۷۱، ص ۳۹

"اگر بالفرض والتقدیر مان بھی لیا جائے کہ یہ اناجیل مروجہ حواریوں اور اُنکے شاگردوں کی تصنیفات سے ہیں تو بھی ان کا الہامی ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عیسائی بالاتفاق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حواریوں و پیغمبروں کی سب تحریریں الہامی نہیں ہوتیں۔ چنانچہ جامعین تفسیر ہنری واسکاٹ اپنی تفسیر مذکورہ کی جلد اخیر میں لکھتے ہیں کہ ضرور نہیں کہ ہر لکھا پیغمبر کا الہامی یا قانونی ہو اور اسلئے کہ حضرت سلیمان نے بعض الہامی کتابیں لکھیں یہ ضرور نہیں کہ جو انہوں نے بطور تاریخ کے لکھا وہ بھی الہامی ہو اور واضح رہے کہ پیغمبر اور حواری خاص خاص مطلب اور موقع پر الہام کئے جاتے تھے[۱۲]۔"

اِن کتابوں کے علاوہ پادری رام چندر وزیر تعلیم ریاست پٹیالہ کی تصنیف دجال مسیح پر انجمن قصور کے سیکرٹری میرزا فتح محمد بیگ نے ہفت روزہ پنجابی کی یکم و ستائیس جنوری ۱۸۷۴ء کی اشاعت میں طویل تبصرے لکھے۔ یہ تبصرے زبان و اسلوب کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہیں۔

مذہبی ادب کا ذکر نا مکمل رہے گا اگر مولوی فیروزالدین ڈسکوی کی خدمات زیرِ بحث نہ لائی جائیں۔ آپ اردو میں متعدد تصانیف کے مالک ہیں۔ نصاب، لغات اور مذہب ان کے اہم موضوعات ہیں۔ انھوں نے لغات فیروزی لکھی اور کرنل ہالرائیڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کی اجازت سے منتخبات العربیہ کا ترجمہ الکلمات الادبیہ کے نام سے کیا۔ عام مذہبی موضوعات پر اُن کی کتابیں ــــــ

۱۲۔ مولوی فقیر محمد جہلمی، زبدۃ الاقاویل فی ترجیح القرآن علی الاناجیل، جہلم، سراج المطالع، ص ۱۸

"نماز اور اس کی حقیقت"[۱۳] اور "عشرۂ کاملہ"[۱۴] قابلِ ذکر ہیں۔ موخر الذکر کتاب آریہ سماج والوں کے اسلام پر دس اعتراضات کا جواب ہے۔

ردِّ نصاریٰ میں مولوی فیروز الدین صاحب کی درج ذیل کتابیں قابل توجہ ہیں۔

۱۔ عصمت النبی عن الشرک الجلی[۱۵]۔

۲۔ تقدیس الرسول عن طعن المجہول[۱۶]۔

۳۔ دفع طعن نکاح زینب۔

مولوی فیروز الدین کا اسلوب تحریر سلیس، واضح اور منطقی ہے۔ جملے چھوٹے چھوٹے اور خطِ مستقیم میں آگے بڑھتے ہیں اور مطلب کے ادا کرنے میں کسی قسم کی دشواری کا احساس نہیں دلاتے۔ مثلاً:

"پس احکام الٰہی عام لوگوں کی رضامندی کے موافق نہیں دئے جاتے نہ انبیاء لوگ عام خلقت کی رضا کے پابند ہیں۔ وہ تو اللہ سے اس کی مرضی کے موافق احکام لیتے ہیں اور خلقت کو بلا کم و کاست پہنچا دیتے ہیں[۱۷]۔"

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ادب کے اس رجحان پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"اس کا سبب کچھ تو یہ ہے کہ اس سے پہلے دور میں عیسائیوں نے کمپنی

۱۳۔ مولوی فیروز الدین ڈسکوی، نماز اور اسکی حقیقت، لکھنو، گلاب سنگھ پریس ۱۸۹۱ء

۱۴۔ ایضاً عشرہ کاملہ، سیالکوٹ پنجاب پریس ۱۸۹۱ء

۱۵۔ ایضاً عصمت النبی عن الشرک الجلی، سیالکوٹ، مفید عام گزٹ ۱۳۱۱ھ

۱۶۔ ایضاً تقدیس الرسول عن طعن المجہول ایضاً

۱۷۔ ایضاً دفع طعن نکاحِ زینب ایضاً ص ۱۲۔

کی حمایت کے سائے میں تبلیغ عیسائیت کا جو پروگرام بنایا تھا۔ اس کے اثرات دیر تک رہے۔ اور کچھ اس وجہ سے کہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد سیاسی سرگرمیوں کیلئے بہت کم گنجائش تھی۔ لہٰذا ساری توجہ ان مشاغل میں مرکوز ہو گئی[۱۸]۔"

سیّد طاہر کی رائے کے دوسرے حصّے میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ کیونکہ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ عوام یا لکھنے والوں کی ساری توجہ مذہبی مباحث یا مناظرہ پر مرکوز تھی تو ان صدہا اصلاحی اور ادبی انجمنوں کے زیرِ اثر پیدا ہونے والے ادب کو نظرانداز کرنا پڑے گا، جو مُلک کے گوشے گوشے سے معرضِ وجود میں آ چکی تھیں یہ مذہبی مباحث ان جُملہ موضوعات کا حصّہ تھے جو غالباً سیاسی سرگرمیوں کے جبری فقدان کے نتیجے میں عوام کے درمیان مقبول ہُوئے تھے۔

۱۸۵۷ کے بعد ہندوستان میں نئی قدروں کے تحت تعمیرِ نو کا عمل شروع ہُوا یہ قدریں نئی سیاسی، سماجی اور اقتصادی صُورتِ حال سے پیدا ہوئیں۔ تعمیرِ نو کا یہ عمل وقت کا اہم تقاضا تھا۔ نئے حکمران نئی سیاست اور نئے تمدن کی آمد مُلک کو تازہ بُنیادوں پر استوار کرنے کیلئے حکومت اور عوام دونوں نے مدد کی۔ ہر طبقے، ہر مذہب اور ہر جماعت کے دانشمندوں نے بجا طور پر احساس کیا کہ نئی صُورتِ حال ایک واضح حقیقت ہے اور اس سے چشم پوشی حقیقتِ حال سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔ انگریز حکومت اپنی قدرت کی آخری حد تک ہندوستانیوں پر ظلم کا استعمال کر چُکی تھی۔ اب شاید یہی راستہ باقی تھا کہ رعایا کی دلجوئی کرتے ہُوئے

۱۸۔ سید عبداللہ، اردو ادب ۱۸۵۷ سے ۱۹۶۶ تک، لاہور، مکتبہ خیابان ادب ۱۹۶۶، ص ۶۵

اس کی شکست خوردہ انا کو سہارا دیکر اسے ہمکاری اور تعاون کے قابل بنایا جائے۔ انگریزوں کے نزدیک اہلِ ھند کی زندگی کے ھر شعبے میں تبدیلی کی ضرورت تھی۔ اہل ہند کی مشرقیت انگریزوں کے نزدیک پس ماندہ تمدن کی علامت تھی۔ اہلِ ھند کی زبانیں سائنسی اور مادی زندگی کو فروغ دینے سے قاصر تھیں لیکن اس کے باوجود انگریز کو ہندوستان میں ایک متمدن رعایا کی بھی اشد ضرورت تھی۔ لہٰذا اہلِ ھند کی زندگی میں انقلاب آفریں تبدیلیوں کیلئے مختلف منصوبوں پر عمل کرنے کی ضرورت محسوس ہُوئی۔ اہلِ ھند نے ان قومی منصوبوں میں حکمرانوں کا ہاتھ بُٹایا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم عام اصلاحی اور ادبی انجمنوں کا قیام تھا جو اہلِ ھند کے ہاتھوں عمل میں آیا اور انگریز حکومت نے اس کی ہر طرح سے سرپرستی کی۔

ملک کے ہر حصّے میں ادبی اور اصلاحی انجمنیں قائم ہوئیں۔ اس سلسلے میں چند انجمنوں کے نام دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔ ان کی تفصیل گارساں دتاسی نے اپنے ۱۸۷۰ سے ۱۸۷۳ تک کے مقالات میں دی ہے۔[19]

۱۔ اہلِ ھند کی اصلاح کی انجمن : کلکتہ۔
۲۔ کمیٹی خواستگاران ترقی تعلیم مسلمانان ھندوستان : بنارس۔
۳۔ انجمن تہذیب۔ : لکھنو۔
۴۔ انجمن رفاہ : گونڈا
۵۔ انجمن اخلاق : علی گڑھ
۶۔ انجمن اصلاح : شاہجہان پور
۷۔ انجمن اصلاح معاشرت : بارہ نگر

۱۹۔ مقالات گارساں دتاسی حصّہ اول ص ۱۱۴ تا ۱۳۲

۸۔ انجمن تہذیب = مظفرپورہ

۹۔ ادبی اور علمی انجمن = بہار

۱۰۔ ادبی انجمن = مغل سرائے

۱۱۔ مرزا پور سوسائٹی = مرزا پور

۱۲۔ ادبی انجمن = ٹپالہ

۱۳۔ سائنٹفک سوسائٹی = مظفرپور

۱۴۔ پنجاب ریفارم ایسوسی ایشن = لاہور

یہ صرف چند انجمنوں کے ناموں کی فہرست ہے جو مثال کے طور پر پیش کی گئی ہے۔
۱۸۵۷ کے بعد اردو کی ترویج و ترقی کا سب سے اہم مرکز پنجاب تھا۔ لہذا پنجاب کے ہر بڑے شہر میں ایک ادبی یا اصلاح معاشرہ کی انجمن کا وجود نظر آتا ہے۔ یوں تو امرتسر، ٹپالہ، پٹیالہ، گوجرانوالہ، راولپنڈی، سیالکوٹ اور پشاور وغیرہ کی تمام انجمنیں قابل ذکر ہیں، اور لازم ہے کہ ان کے کارناموں کا مفصل جائزہ لیا جائے، لیکن طوالت سے بچتے ہوئے صرف دو اہم انجمنوں کا تفصیلی ذکر ضروری ہے ان انجمنوں کی دوسری انجمنوں کے مقابلے میں ہر لحاظ سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ اہمیت ان بے مثال خدمات کی مرہونِ منت ہے جو انہوں نے اہل پنجاب کی زندگی کے مختلف شعبوں میں انجام دیں۔ ہماری مراد لاہور کی انجمن پنجاب اور قصور کی انجمن قصور سے ہے۔

۱۸۶۵ میں مشرقی زبانوں کے نامور ہمدرد ڈاکٹر لائٹنر کی صدارت میں ایک انجمن قائم ہوئی جس کا نام "انجمن اشاعت مطالب مفیدان پنجاب" رکھا گیا۔ اس انجمن کا عام پسند نام انجمن پنجاب تھا۔ پنڈت من پھول رائے نے افتتاحی تقریر میں انجمن کے قیام کا اعلان کیا۔ انجمن کے بانیوں اور ابتدائی عہدہ داروں کی فہرست یہ ہے۔ ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر (پریذیڈنٹ) منشی

ہر سُکھ رائے (سیکرٹری) شعبۂ فارسی، بابو نوین چندر رائے (سیکرٹری) انگریزی سیکشن۔
اس انجمن کے مندرجہ ذیل ارکان ممبر چُنے گئے۔

"۱۔ ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو لائٹنر صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج۔ لاہور۔

۲۔ دیوان بیج ناتھ صاحب۔ ای۔ اے۔ سی۔ لاہور۔

۳۔ فقیر شمس الدین صاحب آنریری مجسٹریٹ، لاہور۔

۴۔ نواب عبدالمجید خان آنریری مجسٹریٹ، لاہور۔

۵۔ پنڈت موتی لعل صاحب مترجم محکمہ لفٹیننٹ گورنر پنجاب۔

۶۔ ڈاکٹر رحیم خاں صاحب اسسٹنٹ سول سرجن سپرنٹنڈنٹ میڈیکل کالج، لاہور۔

۷۔ ڈاکٹر راماچرن بوس اسسٹنٹ سول سرجن، لاہور۔

۹۔ شیخ فیروزالدین رئیس لاہور۔

۱۰۔ منشی جیشی رام ای۔ اے۔ سی۔ امرتسر۔

۱۱۔ منشی امین چند ای۔ اے۔ سی۔ سیالکوٹ۔

۱۲۔ مُنشی حکم چند ای۔ اے۔ سی۔ راولپنڈی۔

۱۳۔ سیّد ھادی حسین خان۔ ای۔ اے۔ سی۔ گجرات۔

۱۴۔ محمد حیات خاں صاحب ای۔ اے۔ سی۔ منول۔

۱۵۔ محمد برکت علی خاں تحصیلدار، لاہور۔

۱۶۔ مُنشی سوہن لعل۔ تحصیلدار، امرتسر۔

۱۷۔ مُنشی رادھا کشن رئیس، لاہور

۱۸۔ پنڈت رام دیال دہلوی۔

۱۹۔ مولوی کریم الدین ڈپٹی انسپکٹر، مدارس لاہور۔

۲۰۔ رائے مول سنگھ رئیس لاہور۔

۲۱۔ مولوی محمد حسین نائب سررشتہ دار ڈائرکٹری پنجاب۔

۲۲۔ مولوی نیاز حسین مدرس مدرسہ تعلیم المعلمین۔

۲۳۔ مولوی علمدار حسین مدرس گورنمنٹ کالج، لاہور۔

۲۴۔ بابو چندر ناتھ کیوریٹر محکمہ ڈائرکٹری۔

۲۵۔ پنڈت امرناتھ مترجم محکمہ جوڈیشل کمشنر پنجاب۔

۲۶۔ بابو شرما چرن ہیڈکلرک ڈائرکٹری پنجاب۔

۲۷۔ منشی گوپال سہائے سررشتہ دار محکمہ فنانشل کمشنر پنجاب۔

۲۸۔ منشی گوپال داس۔ سررشتہ دار محکمہ فنانشل کمشنر پنجاب۔

۲۹۔ رائے گنیشی لعل رئیس دہلی و آنریری مجسٹریٹ۔

۳۰۔ بابو برج لعل۔ } (طلباء میڈیکل کالج)

۳۱۔ لالہ چتن شاد۔

۳۲۔ پنڈت رادھا کشن۔

۳۳۔ محمد علی۔

۳۴۔ جسونت رائے۔[۲۰]"

اس انجمن کے مقاصد درج ذیل تھے۔

"۱۔ قدیم مشرقی علوم کا احیاء۔

۲۔ دیسی زبانوں کے وسیلے سے عام علمی ترقی۔

۲۰۔ آغا محمد باقر، اورینٹل کالج میگزین، مرحوم انجمن پنجاب، لاہور، ۱۹۴۴، ص ۱۲۳، ۱۲۴۔

۳۔ حکومت کو رائے عامہ سے آگاہ کرنے کے لئے علمی وسائل۔

۴۔ معاشرتی مسائل اور نظم ونسق کے مسائل پر تبادلہ خیالات۔

۵۔ پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے ممالک کے درمیان تعلقات استوار کرنا۔

۶۔ ملک کی عام ترقی اور شہری نظم ونسق کی درستی کیلئے کوشاں رہنا۔

۷۔ حاکم و محکوم میں رابطہ اتحاد و موانست کا ترقی دینا۔"[21]

اس اعتبار سے انجمن پنجاب کا دائرہ عمل بہت وسیع نظر آتا ہے۔ و ادب، زبان تاریخ، تمدن، سیاست، اصلاح معاشرہ اور ملکی نظم ونسق غرضکہ زندگی کے ہر شعبے میں دلچسپی لے رہی تھی۔ ان تمام فرائض سے عہدہ برآہ ہونے کے لئے انجمن نے مختلف کمیٹیاں اور تنظیمیں بنا رکھی تھیں۔ انجمن کو نہ صرف حکومت کی سرپرستی حاصل تھی بلکہ اس کے ارکان میں ہر مذہب و ملت اور ہر فرقے کے رؤسا، دانشمند، حتیٰ کہ سیاستدان موجود تھے۔

آغا محمد باقر نے ۱۸۶۸ء کی رپورٹ کو مدِنظر رکھتے ہوئے انجمن کے بارے میں جو تفصیلات دی ہیں ان میں انجمن کے ممبروں اور عہدہ داروں کے ناموں کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ جناب ڈونلڈ میکلوڈ صاحب بہادر سی۔بی۔ لیفٹیننٹ گورنر بہادر ممالک پنجاب۔

۲۔ جناب ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو لائٹنر صاحب بہادر پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور (پریزیڈنٹ)

۳۔ جناب بیڈن پول صاحب بہادر جج عدالت — لاہور۔ وائس پریزیڈنٹ۔

۴۔ فقیر سید جلال الدین صاحب بابو نوبین چندر رائے صاحب آنریری سیکریٹری۔

۵۔ محمد حسین صاحب بھی ابتدائے اپریل ۶۷ سے جون ۱۸۶۸ء تک بعہدہ سیکریٹری

۲۱۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، اورینٹل کالج میگزین، تاریخ اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۶۲، ص ۶

بمشاہرہ ستر (۷۰) روپے ماہوار ملازم رہے۔

۶۔ شیخ نظام الدین صاحب (منشی)

۷۔ شیخ کرم الٰہی سیٹھ (اکونٹنٹ و لائبریری)

۸۔ لالہ گوبند رام خزانچی تحصیل لاہور۔ تحویلدار خزانہ۔

۱۸۶۸ء میں ۲۸ انگریز افسر اور ۱۱ راجہ اور نواب اس میں شامل تھے۔ لاہور کے ممبروں کی تعداد ۹۶ تک پہنچتی تھی۔ ۱۲۳ ممبر بیرونجات کے تھے۔ اس کے علاوہ اہم طالب علموں کے نام بھی ممبروں کی فہرست میں نظر آتے ہیں۔ یہ طلباء گورنمنٹ سکول اور گورنمنٹ کالج میں تعلیم پا رہے تھے۔ مجموعی طور پر اس انجمن کے ۲۶۸ ممبر تھے[۲۲]

انجمن کے تحت مختلف کمیٹیاں تھیں جو اصلاحی، معاشرتی، ادبی اور سیاسی امور میں انجمن کی سرگرمیوں کو آگے بڑھاتے۔

انجمن کے تحت ہفتہ وار لیکچروں کا ایک سلسلہ جاری تھا۔ جس میں مختلف موضوعات پر لیکچر دیئے جاتے تھے۔ انجمن کا اجلاس ہفتے میں ایک بار باقاعدگی سے ہوتا تھا۔ اہلِ علم کو ادب سے وابستہ رکھنے کیلئے ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی بنایا گیا تھا۔ ہفتہ وار لیکچروں، ارکان کی رائے اور مقالات کی اشاعت کیلئے انجمن کی طرف سے اخبار جاری تھا۔ جیسے رسالۂ انجمن پنجاب کہتے تھے۔ اس رسالے نے انیسویں صدی میں اردو ادب کی ترویج و ترقی میں خاص کردار ادا کیا ہے۔ آغا محمد باقر نے انجمن کے قواعد کا خلاصہ مختلف رپورٹوں کی مدد سے تیار کیا ہے جو قارئین کیلئے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اس سے نہ صرف انجمن کی ادبی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ یہ بات بھی روشن ہوتی ہے

۲۲۔ مرحوم انجمن پنجاب ص ۱۷،۱۸

کہ انجمن کا دائرہ کس قدر وسیع تھا، اور اس نے مختلف علوم وفنون کو وسعت دینے میں کس قدر حصہ لیا آغا محمد باقر نے ان مطالب کو شمارہ وار یوں بیان کیا ہے۔

۱۔ "انجمن کے عام جلسوں میں ایسے مضامین پڑھے گئے جن کے سننے سے اخلاق کی تہذیب ہوئی۔ اکثر مؤلفین مروجہ رسوم قبیحہ کا ذکر کر کے عوام کو ان کے ترک کر دینے کا مشورہ دیتے تھے۔ بیشتر مضامین تحصیل علوم وفنون کی ترغیب کیلئے پڑھے جاتے تھے۔ ظاہر ہے اس قسم کے مضامین تمام ملک کے لئے مفید تھے اور یہی وجہ تھی کہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ انجمن خاص و عام میں دور نزدیک محبوب و مقبول ہوتی چلی گئی[۲۳]۔

۲۔ انجمن کے جلسوں میں بعض ایسے معاملات پیش ہوتے تھے جن کا تعلق ہندوستان کے رہنے والوں کی بہتری اور بہبودی سے ہوتا تھا۔ مگر وہ بغیر حکومت کی عنایت اور توجہ کے حل نہیں ہو سکتے تھے۔ ایسے معاملات کو انجمن کے ممبر ضروری گفتگو اور بحث کے بعد سرکار کو بھیج دیتے تھے۔ اسے حسن اتفاق کہئیے کہ انجمن نے جن معاملات کو سرکار میں پیش کیا ان پر سرکار نے ہمیشہ بہت ہمدردی سے غور کیا اور انجمن کی رائے کو اکثر افسران کی رائے پر ترجیح دی۔

۳۔ بعض معاملات سرکاری افسر بغیر رائے عامہ دریافت کئے طے نہیں کر سکتے تھے ایسے معاملات سرکار کی طرف سے انجمن کو بھیج دیئے جاتے۔ ارباب انجمن ان پر کمال ہمدردی سے غور کرتے اور پھر اپنی رائے سے حکومت کو مطلع کرتے تھے[۲۴]۔

۲۳۔ مرقوم انجمن پنجاب ص ۱۳۹

۲۴۔ ایضاً ص ۱۳۹ تا ۱۴۰

۴۔ رفاہ عام کے لئے انجمن نے ایک کتب خانہ جاری کیا تھا۔ اس میں انگریزی، فارسی، عربی اور سنسکرت، ھندی، گورمکھی وغیرہ مختلف علوم و فنون کی کتابیں موجود تھیں۔ اسی کتب خانے میں انگریزی، اردو، فارسی، عربی ھندی کے اخبارات و رسائل بھی آتے تھے[۲۵]۔

۵۔ ہفتے کے دن شام کے وقت مکان انجمن میں ہفتہ وار ایک علمی لکچر اور مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اس میں اہل فضل و کمال اور طلباء بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوتے تھے۔ اوسط حاضری ایک سو کے قریب ہوا کرتی تھی۔ انجمن کی ۱۸۶۷ء کی رپورٹ مولوی محمد حسین صاحب نے لکھی تھی۔[۲۶]"

انجمن کے تحت لیکچروں کا جو سلسلہ جاری ہوا۔ ان میں علمی اور ادبی موضوعات خاص طور پر اہمیت رکھتے تھے۔ آغا محمد باقر نے بتایا ہے کہ ۱۸۶۵ء سے ۱۸۶۸ء تک انجمن کے رسائل میں ۱۴۲ مضامین شائع ہوئے۔ آغا محمد باقر کا خیال ہے:

"کہ یہ مضامین انجمن اور ارباب انجمن اور اس دور کی ملکی ضرورتوں کی دلچسپ اور قابل قدر تصاویر ہیں۔ کوئی تاریخ، کوئی کتاب یا کوئی رسالہ اس دور کی زندگی پر اتنی روشنی نہیں ڈال سکتا جس قدر یہ مضامین۔ یہ مضامین صرف لاہور کے اہل قلم کے نہیں بلکہ ان کے لکھنے والے پنجاب کے مختلف شہروں اور علاقوں کے رہنے والے تھے۔ اکثر و بیشتر لکھنے والے ایسے ہیں جن کے نام سوائے انجمن کے رسائل میں کسی اور کتاب میں نہیں دیکھے گئے[۲۷]۔"

۲۵۔ مرحوم انجمن پنجاب ص ۱۴۰

۲۶۔ ایضاً

۲۷۔ ایضاً ص ۱۴۳، ۱۴۴

ان لکھنے والوں میں مولوی محمد حسین آزاد، منشی محمد علی، منشی گوپال داس (گوجرانوالہ) منشی جمنا پرشاد (لدھیانہ) منشی ہرسکھ رائے، فقیر سید جمال الدین، ڈاکٹر محمدی حسین خاں اور منشی کرم الٰہی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

انجمن کے لئے مستقل تصانیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ جس میں اردو، ھندی اور فارسی میں مختلف ادبی اور علمی موضوعات پر کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ انجمن کے تحت ہفتہ وار لیکچروں میں جن کی طرف ۱۸۶۵ میں کمشنر لاہور نے انجمن کے صدر ڈاکٹر لائٹنر کو متوجہ کیا تھا۔ ان لیکچروں کا افتتاح ڈاکٹر لائٹنر کے عالمانہ لیکچر سے ہوا جس کا موضوع تھا "عادات باشندگان ترکستان" اس کے بعد مسٹر اسٹن نے دس لیکچر دیئے۔ پہلے چار لیکچر کرۂ زمین کے بارے میں دوسرے چار لیکچر آئرلینڈ، انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ اور ویلز کے جغرافیائی اور تاریخی حالات کے بارے میں۔ نواں لیکچر احسن طریقہ تعلیم اور ترقی تعلیم کے بارے میں، دسواں لیکچر تمام دنیا کے مختصر حالات پر دیا گیا۔

مولوی محمد حسین آزاد نے انجمن کے تحت ادبی لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا انکی فہرست یہ ھے:

۱۔ زبان اردو کی تاریخ اور نشوونما۔

۲۔ اصلیت زبان اردو۔

۳۔ نظم اور کلام موزوں۔

۴۔ شمس ولی اللہ، موجد شاعری اردو۔[۲۸]

اس کے علاوہ انھوں نے شاہ حاتم، شاہ ہدایت اور شیخ ابراہیم ذوق

۲۸۔ مرحوم انجمن پنجاب ص ۱۷۱، ۱۷۲۔

پر بھی لیکچر دیے۔ انجمن پنجاب کی ادبی خدمات میں دو چیزوں کا تذکرہ نہایت اہم ہے پہلے اردو ادب کے جدید تقاضوں پر مولوی محمد حسین پر آزاد کی تقریر اور دوسرے انجمن کے تحت مشاعروں کا آغاز۔ ان کی مفصل روداد اگلے باب میں بیان ہوگی۔

انجمن نے اصلاح تعلیم کے سلسلے میں جو کوشش کی اس کے نتیجے میں پہلے یونیورسٹی کالج عمل میں آیا اور اس کے بعد اس یونیورسٹی کالج میں پنجاب یونیورسٹی نے شکل اختیار کی۔

انجمن کے رسالے، اخباروں اور انجمن پر عبدالسلام خورشید اور امداد صابری نے اپنی کتابوں میں مفصل لکھا ہے۔ اخبار انجمن کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے عبدالسلام خورشید نے مندرجہ ذیل نکات بیان کئے ہیں۔

۱۔ آرٹیکل یعنی جو امور وقتاً فوقتاً غور طلب ہوں۔ ان پر اپنی اور اہل ملک کی رائے۔

۲۔ ایضاً دیگر انگریزی اور دیسی اخباروں کی رائے۔

۳۔ مضامین علمی و بیان عیب و ثواب کتب وغیرہ نو تصنیف شدہ۔

۴۔ حالات ممالک غیر اور ذکر رسم و رواج مختلف اقوام یورپ، ایشیا، افریقہ امریکہ کا۔ جو اب تک اس ملک کے لوگوں کو معلوم نہیں اور حال ان ممالک کی تاریخ قدیم کا۔

۵۔ خطوط اور خبریں۔

۶۔ خلاصۂ قوانین و احکامات تبدیلی و تقرری وغیرہ عہدہ داران و ملازمین سرکاری۔

۷۔ اشتہارات مفید عام و مفید خاص۔[۲۹]

۲۹۔ صحافت پاکستان و ہند میں۔ ص ۲۵۵، ۲۵۶

انجمن پنجاب کے اہم ترین علمی و ادبی خدمات میں یونیورسٹی کالج کے قیام کی کوشش بھی ہے۔ یہی یونیورسٹی کالج بعد میں پنجاب یونیورسٹی کی حیثیت اختیار کر گیا۔ یونیورسٹی کالج کی تجویز ڈاکٹر لائٹنر نے انجمن پنجاب کے ارکان کے سامنے ۲۲ اگست ۱۸۶۵ء میں پیش کی۔ اس جلسے میں تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر لائٹنر نے کہا:

"ضروری ہے کہ لاہور میں ایک یونیورسٹی قائم کی جائے۔ جس میں رؤسا کی امداد سے سب طرح کے فنون اور علوم مشرقی و مغربی طلبا کو سکھائے جائیں۔ پنجاب کے رئیسوں اور مہاراجوں سے چندہ لیا جائے"[۳۰]

"آغا محمد باقر کے بقول ارباب انجمن نے بخوشنودی تمام اس تجویز کی داد دیتے ہوئے خیر مقدم کیا۔ قرار پایا کہ ایک جلسہ رئیسان لاہور کا طلب کیا جائے۔ انجمن کی طرف سے ہر دو سکرٹری بابو شاماچرن اور محمد برکت علی خاں تحصیلداران لاہور اس میں شامل ہوئے۔ اس جلسے کے بعد ہر محفل میں یونیورسٹی کے چرچے ہونے لگے۔ جگہ جگہ جلسے ہوئے چٹھیاں لکھی گئیں۔ اخبارات میں مقالات شائع ہوئے۔ ہوتے ہوتے انگلستان میں خبریں پہنچ گئیں"[۳۱]۔

"مئی ۱۸۶۶ء میں تین ماہ کے لئے ایک یونیورسٹی کالج اور مدرسہ کھولا گیا عربی، فارسی، اردو، سنسکرت اور ہندی پڑھانے کے لئے معلم رکھے گئے ۱۸ مئی ۱۸۶۷ء کو گورنر پنجاب جلسہ یونیورسٹی کمیٹی میں تشریف لائے۔

۳۰۔ مرقوم انجمن پنجاب

۳۱۔ ایضاً

پہلے انہوں نے کتب خانے کی سیر فرمائی پھر کالج اور مدرسہ کا معائنہ کیا
اس کے بعد گورنر صاحب جلسہ انجمن میں شریک ہوئے[۳۲]۔"

معلوم ہوتا ہے کہ یونیورسٹی کالج کی شہرت ملک سے باہر دور دور تک پہنچ چکی تھی گارساں دتاسی نے اپنے مقالات میں اس کا جا بجا ذکر کیا ہے۔ گارساں دتاسی نے یونیورسٹی کالج کی طرف سے منعقد کیے گئے ایک علمی مقابلے کا بھی ذکر کیا ہے جس میں سائنس پر اردو زبان میں بہترین رسالہ لکھنے پر انعام دینے کا اعلان کیا گیا ایک دوسرے موقع پر کالج پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ڈاکٹر لائٹنر نے جو اسی کالج کے پرنسپل ہیں۔ اپنی رپورٹ میں اس کالج کی ترقی کے نہایت امید افزا حالات بیان کیے ہیں۔ مجھے پوری توقع ہے کہ عنقریب یہ کالج خوب فروغ حاصل کرے گا۔ اس کالج کا سرمایہ جنوری ۱۸۷۰ میں ۱۰۵۶۰۳ روپے تھا اور اب ۲۹۴۴۶۷ روپے ہے۔ اس کی سالانہ آمدنی پہلے ۲۲۶۸۰ روپے تھی اور اب ۲۲۲۴۰ روپے سالانہ ہے۔ اس درس گاہ کی بدولت پنجاب میں سرکاری کالجوں کی تعداد اب ۳۴ ہو گئی ہے۔ اس میں طلباء کی تعداد ۷۷۶ ہے جو سب ۱۶ سال کی عمر سے زیادہ کے ہیں۔ رپورٹ میں ان امیدواروں کی تعداد درج ہے جنہوں نے امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اب انھیں وہ فوائد حاصل ہوں گے جن کے وہ متوقع تھے کامیابی حاصل کرنے والے امیدواروں میں ۱۷ مسلمان اور ۹۴ ہندو اور سکھ ہیں[۳۳]۔"

۳۲- مرحوم انجمن پنجاب۔

۳۳- مقالات گارساں دتاسی- جلد اول ص ۱۰۴، ۱۰۵۔

اسی طرح ۱۸۷۲ر کے مقالے میں یونیورسٹی کالج کی طرف سے جلسہ تقسیم انعامات کی تفصیل مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کی ہے۔

"۲۲ر نومبر ۱۸۷۱ کو پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر کی صدارت میں یونیورسٹی کالج کے طلباء کو انعامات تقسیم کرنے کیلئے لاہور میں ایک بڑا دربار منعقد ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اتنا بڑا دربار پنجاب میں پہلے کبھی نہیں منعقد ہوا تھا۔ جلسے کی تاریخوں سے پہلے ہی لفٹیننٹ گورنر کی دعوت پر پنجاب کے امرا و رؤسا جمع ہو گئے تھے۔ عورتوں کیلئے نشستیں خاص طور پر محفوظ رکھی گئی تھیں۔ ایک طرف انگریزوں کی نشستیں تھیں اور دوسری طرف ہندوستانیوں کی۔ لفٹیننٹ گورنر کی نشست سب سے علاوہ تھی۔ اور اس کے دونوں طرف حکومت کے معتمدین، ڈاکٹر لٹنر اور پنجاب یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ (مسٹر پیرسن) ان کے سامنے میزوں پر کتابیں اور دوسری انعامی اشیاء بھی رکھی ہوئی تھیں اور جن طلباء کو یہ انعام ملنے والے تھے وہ بھی وہیں نزدیک بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹھیک دس بجے لفٹیننٹ گورنر دربار میں داخل ہوا اور اجلاس شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر لائٹنر نے گذشتہ سال کی رپورٹ انگریزی زبان میں پڑھی۔ اس کے بعد چندہ ہوا اور تقریباً تین لاکھ روپے کے قریب وعدے ہوئے۔ ہمیں توقع ہے کہ آئندہ سال رقم اس سے زیادہ جمع ہو سکیگی۔ طلبا کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ پنجاب کے ہر ضلع سے ہر عمر کے طالب علم تعلیم سے مستفید ہونے کیلئے آتے ہیں۔ جب ڈاکٹر لائٹنر اپنی رپورٹ پڑھ چکے تو انھوں نے اس کا انگریزی سے ہندوستانی میں نہایت فصاحت سے ترجمہ ان لوگوں کے لئے کر دیا جو انگریزی زبان

سے ناواقف تھے۔ اس کے بعد لفٹیننٹ گورنر نے تقریر کی اور پھر انعامات تقسیم کیے گئے۔ بعض طالب علموں کو اتنی کتابیں ملیں کہ وہ انھیں اٹھا نہیں سکتے تھے۔ جب انعامات تقسیم ہو چکے تو حاضرین میں سے ایک ممتاز شخص نے جس کا نام راجا بہادر فہدی (؟) تھا ایک باموقع تقریر کی جسمیں اہلِ پنجاب کو اس امر کی مبارکباد دی کہ انھوں نے عام تعلیم کیلئے ایک نہایت مفید ادارہ قائم کر لیا ہے۔ اس کے بعد مسٹر لیپل گریفن نے جو معتمدِ حکومت ہیں اور جنھوں نے پنجاب کے راجاؤں کے متعلق ایک اہم کتاب ابھی حال ہی میں شائع کی ہے۔ تقریر کی اور اُمید ظاہر کی کہ بہت جلد یونیورسٹی کامیاب طلبا کو انتہائی اور اعلیٰ ترین امتحانات کی ڈگریاں دینے لگے گی۔ جس روز دربار منعقد ہُوا اسی روز لفٹیننٹ گورنر کے حکم سے ۱۶ اُمرائے پنجاب کی ایک مجلس بنا دی گئی ہے جو سینٹ کے ارکان ہیں تاکہ اعلیٰ تعلیم کی تنظیم کے متعلق غور کیا جائے۔ پنجاب کے لفٹیننٹ گورنر نے یونیورسٹی کی ترقی کیلئے جس دلچسپی کا اظہار کیا ہے، اس سے امید بندھتی ہے کہ کامیابی یقینی ہے۔[۴۳]"

انجمن پنجاب کی ادبی خدمات پر بحث کرتے ہُوئے اس کے اہم مقاصد اور بُنیادی چھ نکاتی پروگرام کو ضرور مدِنظر رکھنا چاہیے۔ ان نکات میں سے جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے پہلے دو نکتے ادبی اہمیت کے اعتبار سے خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ یعنی:

---

۴۳ - مقالاتِ گارساں دتاسی جلد اول ص ۲۵۴، ۲۵۶

۱۔ قدیم مشرقی علوم کا احیاء۔

۲۔ دیسی زبانوں کے وسیلے سے عام علمی ترقی۔

ان اہم منصوبوں کی تکمیل کیلئے پنجاب کو بیک وقت دو اہم ادارے اور دو اہم سرکاری سرپرست ملے۔ ایک انجمن پنجاب جس کو ڈاکٹر لائٹنر جیسے ذی علم اور مشرق دوست دانشمند کی سرپرستی حاصل تھی اور دوسرا ادارہ محکمہ تعلیمات پنجاب جس کے ڈائرکٹر مشرقی ادبیات بالعموم اور اردو زبان بالخصوص کے محسن اور مربی کرنل ہالرائیڈ تھے۔ اور ایک لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو انجمن پنجاب اور محکمہ تعلیمات پنجاب مختلف جہتوں کے باوجود ایک ہی راہ پر گامزن تھے جس کا ہدف انجمن پنجاب کے مندرجہ بالا دو نکات سے واضح ہوتا ہے۔ یعنی قدیم مشرقی علوم کا احیا اور دیسی زبانوں کے وسیلے سے عام علمی ترقی۔

ڈاکٹر لائٹنر نے انجمن پنجاب میں اور کرنل ہالرائیڈ نے محکمہ تعلیمات میں اپنے زمانے کی فاضل ترین شخصیتوں کو جمع کیا۔ انجمن پنجاب کے جلسے اگر ایک طرف ادب کی نئی جہتوں کو تلاش کرنے کے لئے پلیٹ فارم کا کام دیتے تھے تو دوسری طرف انجمن پنجاب کا مطبع اخبار انجمن پنجاب اور محکمہ تعلیمات کا مطبع سرکاری ان افکار اور منصوبوں کو عملی جامہ پہناتا تھا۔ اس سے پہلے کہ ان وسیع خدمات کا مختصر تذکرہ کیا جائے جو انجمن نے اور محکمہ تعلیمات سے واسطہ ادیبوں اور دانشمندوں نے انجام دیں، مناسب ہوگا کہ ان شخصیتوں کو یاد کیا جائے، جن کے وسیلے سے پنجاب ۱۸۵۷ء کے بعد ادب کا اہم مرکز قرار پاتا ہے۔ اور پنجاب کے پایۂ تخت لاہور کے بارے میں اس دور کے اہم ادیب اور شاعر مولانا فیض الحسن سہارنپوری مندرجہ ذیل شعر کہتے ہیں:

بناوٹ اس میں نہیں ہے کہ ان دنوں لاھور
برے بھلے کا ٹھکانہ ہے دوست دشمن کا

ان ادیبوں اور شاعروں کے دو گروہ ہیں ۔ ایک وہ جو خالص پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسرے وہ جو ۱۸۵۷ کے بعد پنجاب کی ادبی ثروت میں اضافہ کرنے کیلئے ملک کے دوسرے حصّوں سے آکر پنجاب میں آباد ہوئے ہیں ۔ انجمن پنجاب کے قیام کے آس پاس پنجاب کے مختلف حصّوں میں جو لکھنے والے موجود تھے ان کی ایک نا تمام فہرست درج ذیل ہے ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صاحبِ تصنیف و تالیف بھی ہیں ۔ ان کی تالیفات کے ذیل میں بھی آئندہ سطور میں ان کے نام لیے جائیں گے ۔

مرزا اعظم بیگ (گجرات) منشی نظام الدین (لاھور) شیونا تھ منتظر (لاہور) مفتی غلام سرور (لاہور) سردار دھیان سنگھ (لاہور) میراں صاحب نامی (گوجرانوالہ) سید نصرت علی (لاہور) مولوی کریم بخش (لاہور) مادھو سروپ (لاہور) امبا پرشاد (سیالکوٹ) مولوی فقیر محمد (جہلم) فیروز الدین (سیالکوٹ) نادر علی سیفی (لاہور) منشی محمد اعظم (لاہور) لالہ ہرسکھ رائے (لاہور) سردار دیال سنگھ مجیٹھیہ (لاہور) منشی کنہیا لعل (سیالکوٹ) غلام محمد (سیالکوٹ) سلطان علی صولت (جالندھر) پادری رجب علی (امرتسر) سید رجب علی (لاہور) منشی قادر بخش (انبالہ) مولانا الطاف حسین حالی (پانی پت)[۳۵]

دوسرے گروہ کے شعراء اور ادیبوں کو اہل پنجاب کا مہمان نہیں بلکہ جلیس اور ہمدم کہنا چاہیے ۔ ان میں مندرجہ ذیل لکھنے والے شامل تھے ۔

---

۳۵ ۔ یہ فہرست امداد صابری کی کتاب " اردو صحافت " کی مدد سے مرتب کی گئی ہے ۔

مولانا محمد حسین آزاد، مرزا اشرف علی اشرف، گوری شنکر مجذوب، اعجاز مرزا، مولانا فیض الحسن، میر ناظر حسین ناظم، امو جان ولی، فتح الدین بسمل، منشی پیارے لعل آشوب، مرزا ارشد گورگانوی، مولوی سیف الحق ادیب، میر نثار علی شہرت وغیرہ۔

انجمن پنجاب کے ساتھ جن صاحبِ قلم کی خدمات بطور خصوصی وابستہ تھیں، ان میں مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، منشی پیارے لعل آشوب، مرزا ارشد گورگانوی، مولوی سیف الحق ادیب وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

انجمن پنجاب کی دیگر ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ ایک نہایت قابلِ قدر خدمت نئی شاعری کے مشاعرے کا اجراء تھی۔ گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ یہ مشاعرہ پنجاب کے ناظم تعلیمات میجر ہالرائیڈ کی خواہش پر شروع کیا گیا تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> "پنجاب کے ناظم تعلیمات میجر ہالرائیڈ نے اس طرح توجہ کی ہے کہ زبان کو اور جلا دی جائے اور اسے ترقی دی جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔ زبان کی ایک نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ اور اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ مکمل ہو کر رہے گی۔ اس مقصد کیلئے انھوں نے انجمن لاہور سے اجرار کیا ہے کہ ہر مہینے ایک مجلس مشاعرہ منعقد کی جائے۔ جس میں اچھے انداز میں حقیقی اور دلچسپ موضوعوں پر لکھی ہوئی نظمیں پڑھی جائیں اور عشقیہ غزلیں یا قصیدے نہ لکھے جائیں۔ شعراء جن کے دماغوں پر اس دعوت کا اثر ہو گا خاص طور پر موردِ عنایت ہوں گے۔ ایک خاص کمیٹی کے تصفیے کے بعد انھیں انعامات اور صلے دیئے جائیں گے[۳۶]۔"

۳۶۔ مقالات گارساں دتاسی جلد اول ص ۱۰۴، ۱۰۵

دتاسی کے بقول مولانا آزاد نے انجمن پنجاب کے ایک جلسے میں ہالرائیڈ کی اس تجویز کی حمایت میں ایک تقریر کی۔ یہ غالباً اردو شاعری کے پہلے مشاعرے کے تعارفی جلسے کا ذکر ہے۔ جس میں آزاد نے نئی شاعری کے اس انقلاب آفریں منشور کا اعلان کیا جو اردو شاعری کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دتاسی کے الفاظ ہیں:

"مولوی محمد حسین المتخلص بہ آزاد پروفیسر لاہور کالج نے انجمن کے ایک جلسے میں اس تجویز کی حمایت میں ایک تقریر کی ہے، جو میجر ہالرائیڈ کی خواہش کی تائید میں ہے۔ اور ان کے نظریوں سے اتفاق رائے رکھتی ہے[۳۷]۔"

مولانا الطاف حسین حالی نے دتاسی کے برعکس نئی شاعری کا "بنیادی" محرک "آزاد" کو قرار دے کر میجر ہالرائیڈ کو اس تجویز کا "مؤید" ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"۱۸۷۴ میں جب کہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق لاہور میں مقیم تھا، مولوی محمد حسین آزاد کی "تحریک" اور کرنل ہالرائیڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی "تائید" سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ کیا تھا، جو ہر مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری کو جو کہ دردلبست عشق اور مبالغہ کی جاگیر ہوگئی اسکو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے[۳۸]۔"

حالی کے اس بیان کی تائید کرتے ہوئے پنڈت دتاتریا کیفی نے بھی لکھا ہے کہ:

"مولانا آزاد مرحوم کو ۱۸۷۴ء سے بہت برس پہلے اردو کی تجدید اور اصلاح کا

---

۳۷ - مقالات گارساں دتاسی جلد دوم، مطبوعہ انجمن ترقی اردو، ص ۱۳۔

۳۸ - مجموعہ نظم حالی۔ گورودت ہاؤس، دوسرا ایڈیشن، دیباچہ ص ۱، ۳۔

خیال پیدا ہُوا تھا۔ خُدا معلُوم کب سے یہ دُھن ان کے دماغ پر حاوی تھی۔ تاریخی ثبوت ہمیں ۱۸۶۷ء تک پہنچاتا ہے۔[39]"

نئی شاعری کا مشاعرہ برپا کرنے کے لئے جو تجویزی جلسہ منعقد ہُوا اس کی روئداد پنڈت کیفی نے معاصر اخبار "کوہ نور" کے حوالے سے بیان کی ہے۔ جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ کوہِ نوُر لکھتا ہے:

"یہ عظیم الشان جلسہ جس کی تاریخی عظمت ادبی دُنیا میں کسی جلسہ سے کم نہیں" ۱۹ / اپریل ۱۸۷۴ء کو شام کے چھ بجے انجمن کے اہتمام سے سکشا سبھا کے مکان میں منعقد ہُوا۔ حاضرین میں ہندوستانی اصحاب کے علاوہ کرنل ہالرائیڈ، مسٹر جسٹس بولنو جج چیف کورٹ، مسٹر تھارنٹن سیکریٹری پنجاب گورنمنٹ، کرنل مکلاگن، مسٹر ینگ کمشنر اور لسنٹ ڈپٹی کمشنر لاہور اور نواب عبدالمجید خاں، فقیر سیّد قمر الدین وغیرہ اصحاب تشریف رکھتے تھے۔ مسٹر جسٹس بولنو صدر تھے۔ اِس جلسہ میں آزاد مرحوم نے ایک زبردست تقریر کی۔ جس کا ملخص نہایت خسیت اور تنگ دلی سے پیش کیا جاتا ہے"۔

"اے گلشنِ فصاحت کے باغبانو! فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغہ اور بلند پروازی کے بازوؤں سے اڑے، قافیوں کے پروں سے فرفر کرتے گئے لفاظی اور شوکتِ الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہہ میں ڈوب کر غائب ہوگئے ... تب ہمیں اِس موقع پر کیا کرنا

۳۹۔ برجموہن دتاتریہ کیفی، منشورات، دوسرا ایڈیشن دہلی دریاگنج ۱۹۴۰ء ص ۲۵۸، ۲۵۹۔

چاہیئے ۔ ہمیں چاہیئے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں سادگی اور اظہار اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں، لیکن انہی پر قناعت ناجائز، کیونکہ اب زمانہ کچھ اور ہے ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ فصاحت و بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے ۔ جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے، ہار طرّے ہاتھوں میں لئے کھڑی ہیں ۔ اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے ۔ لیکن اب وہ بھی منتظر ہے کہ کسی صاحب میں ہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کے آگے بڑھائے[۱۸]۔"

اس تقریر کے اقتباس تقریباً تمام معاصر اخبارات میں نقل ہوئے ہیں۔ سب سے مفصل اقتباس گارساں دتاسی نے اپنے مقالات میں درج کیا ہے جو مطبوعہ مقالات کے حصہ دوم میں موجود ہے ۔ آزاد کی صدا پر اگر ایک طرف روشن فکر معاصرین نے لبیک کہا تو دوسری طرف سست روایتی طرزِ فکر کے ادیبوں اور شاعروں نے سخت مخالفت بھی کی ۔ جس کی روداد معاصر اخباروں کے حوالے سے گارساں دتاسی نے بیان کی ہے ۔ دتاسی نے اخبار "پنجابی" کے حوالے سے لکھنو کے ایک ادیب سید غلام حسین کے مقالے کا ذکر کیا ہے ۔ جو آزاد کی اس تقریر کی مخالفت میں لکھا گیا ہے اس مقالے کا کچھ حصہ درج کیا جاتا ہے:

"مولوی محمد حسین کی تقریر فصیح و بلیغ اور قابلیت سے پر تھی ۔ محض یہ کہ مولوی صاحب نے جو کچھ غلطی سے اردو میں کہا، انھیں

---

۱۸ - کوہ نور، لاہور، ۱۶ رمئی ۱۸۷۷ء بحوالہ منشورات ص ۲۶۰، ۲۶۱۔

انگریزی میں کہنا چاہیے تھا۔ مزید براں ان لوگوں کیلئے جو انگریزی جانتے ہیں، ان کی تقریر بہت خوب اور خوش مذاقی کا نمونہ تھی۔"

"اس اردو کو جو بظاہر ہندوستانی اور دراصل انگریزی ہوگی ہماری سرکار رواج دینا چاہتی ہے۔ لیکن جب وہ ہندوستان جو بدقسمتی سے انگریزی نہیں جانتے اس تقریر کو پڑھیں گے تو اس کی صورت دیکھکر کہیں گے۔ یہ لفاظی، یہ ترتیب خیالات کا مربوط سلسلہ، یہ پیاری زبان، زبان کا یہ زور جو ہم نے اپنے کسی شاعر یا سخن گو کے کلام میں نہیں پایا۔ ان سب چیزوں کی مجموعی شکل ایسی ہے جس سے ہم ششدر رہیں، لیکن ہمیں اپنی محدود عقل اور اپنی کند طبیعت پر رونا آتا ہے کہ اس تقریر کو کئی بار پڑھ کر بھی یہ نہ سمجھ سکے کہ مولوی صاحب کس چیز کی شکایت فرما رہے ہیں[۴۱]۔"

انجمن پنجاب کا پہلا مشاعرہ مندرجہ بالا کوششوں کے زیر اثر ۳۰ جولائی ۱۸۷۴ء کو انجمن پنجاب کے مکان میں منعقد ہوا۔ کیفی صاحب نے اس کی مفصل روئداد بیان کی ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

"... نقل غالباً یہ نئی شاعری کا اولین مناظمہ ہے۔ اس میں تو شعراء نے اپنی نظمیں پڑھ کر سنائیں۔ آئندہ مناظمہ کیلئے امید موضوع قرار پایا، وہ شعراء حسب ذیل ہیں:

۱۔ شاہ انور حسین ہما۔ ۲۔ مرزا اشرف بیگ اشرف (نظم کا عنوان تھا = (برد عجوز) ۳۔ منشی الٰہی بخش رفیق (عنوان دیخ لستہ)[۴] حضرت آزاد[۵] مولوی مقرب علی۔ ۶۔ مولوی امو جان ولی۔ ۷۔ مولوی قادر بخش۔ ۸۔ مولوی عطا اللہ

۴۱۔ مقالات گارساں دتاسی حصہ دوم ص ۲۰، ۲۱

۹۔ مولوی علاؤالدین محمد کاشمیری اس مناظمے کیلئے موضوع زمستان مقرر تھا۔"[۴۲ل]

گارساں دتاسی نے انجمن کے دوسرے، تیسرے، چوتھے، پانچویں اور چھٹے مشاعرے کی سرگذشت بھی معاصر اخباروں کی مدد سے بیان کی ہے۔ بے محل نہ ہوگا اگر یہاں اس تفصیل کو نقل کر دیا جائے جو دتاسی نے ان مشاعروں کے بارے میں بیان کی ہے۔ جبکہ باقی مشاعروں کا حال ڈاکٹر صفیہ تمنائی کے مضمون "انجمن پنجاب کے مشاعرے" سے لیا جو انھوں نے نقوش جنوری ۱۹۷۷ کے سالنامے میں لکھا ہے۔ چنانچہ دتاسی لکھتے ہیں:

"اب انجمن پنجاب کے دوسرے مشاعرے کی کچھ تفصیلات سنیئے۔ یہ پہلے مشاعرے کے اصول پر منعقد کیا گیا تھا۔ جو مولوی محمد حسین کی تقریر کیوجہ سے ممتاز تھا۔ طے شدہ تجویز کے مطابق ایک خاص مشاعرہ پہلے مشاعرے کے ایک ماہ بعد ۳۰ مئی کو منعقد ہوا۔ یہ مشاعرہ گذشتہ مشاعرے سے زیادہ بارونق تھا بہت سی ممتاز شخصیتوں، ممتاز عہدہ داران عدالت اور معزز روساء نے اس میں مدد دی ہے۔ عہدہ داران و ملازمین سرکار، کالجوں اور مدارس کے اساتذہ اور طلبا و پنجاب یونیورسٹی کے ممبر اور علم دوست حضرات نے شرکت کی۔ جب سب لوگ جمع ہو چکے تو لاہور کالج کے پروفیسر مولوی الطاف حسین المتخلص بہ حالی نے اپنی نظم پڑھی۔ جس کا عنوان "برکھارت" تھا۔ اس کے بعد مولوی الطاف علی نے جو گورنمنٹ گزٹ کے اردو مترجم ہیں۔ اسی موضوع پر ایک نظم "آب کرم" پڑھی۔ اگرچہ ان دونوں نظموں کا موضوع موسم برسات تھا، لیکن دونوں شاعروں کے خیالات مختلف تھے۔ مصرع مشہور ہے:

---

۴۲ ل۔ منشورات ص ۲۶۶، ۲۶۷۔
گارساں دتاسی کے بیان کے مطابق تیسرے مشاعرے کا موضوع "زمستان" تھا دیکھئے مقالات گارساں دتاسی حصہ دوم ص ۱۲۰

"ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" دونوں شعراء کے کلام میں الگ الگ قسم کی دلپذیر خصوصیت اور حسن کا بانکپن تھا۔[۴۳]"

"اس کے علاوہ پانچ اور شعراء کی نظمیں پڑھنے کے لائق ہیں۔ یہ مجلس مشاعرہ اس قدر مفید ثابت ہوئی ہے کہ اس کی قوی اُمید ہے کہ آئندہ مشاعرے اور زیادہ کامیاب ہوں گے اور گورنمنٹ پنجاب کے مسٹر ہالرائیڈ کا ایک نیا مقصد جو ان کے قیام سے وابستہ تھا میری رائے میں پوری طرح حاصل ہو کے رہے گا کہ اردو شاعری خیالات فاسد اور بے ہودہ مضامین سے پاک ہو جائے گی۔ اور ان کی بجائے دُنیا کی چیزوں کی تفصیلی تصویریں پیش کی جائیں گی۔[۴۴]"

"جب شعراء اپنی نظمیں سُنا چکے تو ناظم صاحب تعلیمات نے اطلاع دی کہ مشہور ہندوستانی ادیبوں کی ایک کمیٹی قائم کی جائے گی کہ کونسی نظمیں انعام کی مستحق ہیں۔ اس کے بعد طے کیا گیا کہ آئندہ مشاعرے کا موضوع سراپا "زمستان"

"پنجابی"[۴۵] نے اس تیسرے جلسے کے انداز کا ذکر یُوں کیا ہے۔ "مختلف فرقے کے لوگ اپنے آپ کو یُوں یک جا دیکھ کر متحیر ہوئے۔ مجمع کو دیکھ کر دلی کے اردوئے معلی کے بازار کا دھوکا ہوتا تھا۔ دس یا

۴۳۔ مقالات گارساں دتاسی حصّہ دوم ص ۳۰، ۳۱

۴۴۔ ایضاً ص ۳۱۔

۴۵۔ ہفتہ وار "پنجابی" مورخہ ۴ جولائی ۱۸۷۴ء (حاشیہ از گارساں دتاسی) حصّہ دوم۔ ص ۳۱

بارہ شعراء ایسے بھی تھے جن کو پہلی بار اپنا کلام سنانے کا موقع ملا تھا۔ ان کے اشعار کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ دلی اور پنجاب کے شعراء ناظم صاحب تعلیمات کے مقاصد کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں اور یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اس قسم کی دو تین مجلسوں کے بعد وہ شراب و ساقی کا ذکر ترک کر دیں گے اور مناظر قدرت کی تصویر کھینچیں گے ہم اپنے اعلیٰ خیال شعراء سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے طرزِ تحریر کو نہ بدلیں اور حسب سابق ہمارے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلیں۔ جدت پسندوں کی زیادہ قدر نہیں ہوئی کیونکہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس قسم کی نظموں کو پسند کر سکتے ہیں ۔ ۔ ۔"

"اس کے بعد مضمون نگار نے چند نظموں کا جو پڑھی گئی تھیں سلسلے وار ذکر کیا ہے۔ ان پر عام طور پر تنقید کی ہے۔ اس سلسلے میں محمد حسین آزاد کا ذکر کرتے ہوئے جس کی تقریر پر ہندوستان بھر میں سخت تنقید ہوئی لکھا ہے کہ " اپنے نام کی مناسبت سے انھوں نے شاعروں کو ہر طرح سے آزادی دیدی ہے۔ ان کی نظم کا تین چوتھائی حصہ تو ان کے اساتذہ کا ترجمہ ہے جو ایک جگہ ڈھیر کر دیا گیا ہے۔ انھوں نے ان چیزوں کا ذکر کیا ہے جنہیں کسی نے نہ کبھی دیکھا اور نہ بیان کرنے کا قصد کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ایک ایسے خواب کی تصویر کھینچی ہے جس کی تعبیر ممکن نہیں۔ مثلاً کیا کبھی تمہارے ملک میں ایسی سردی ہوئی ہے کہ دریاؤں کا پانی یخ بن گیا اور بلا کشتی کے لوگ دریاؤں کے پار جانے لگے۔ ہم تو اپنی سرزمین کے مناظر کی تصویر

دیکھنا چاہتے تھے - اور آزاد نے ان گاڑیوں کا ذکر کیا ہے جنہیں سرد ممالک کے بارہ سنگھے کھینچتے ہیں - ان ممالک کا نقشہ کھینچا ہے جو ہمیشہ برف سے ڈھکے رہتے ہیں اور طرفہ ماجرا یہ ہے کہ انھوں نے لکھا ہے کہ سرما کی شدت سے شیطان کی سلطنت کا اندازہ ہوتا ہے "[۴۶]

---

۴۶ - اخبار پنجابی نے آزاد پر اعتراض کیا ہے کہ آزاد نے ایسے خواب کی تعبیر کھینچی ہے جس کی تعبیر ممکن نہیں - مثلاً کیا کبھی ہمارے ملک میں سردی ہوئی ہے کہ دریاؤں کا پانی یخ ہو جائے - اور بلا کشتی لوگ دریاؤں کے پار جانے لگیں - اور آزاد نے ان گاڑیوں کا ذکر کیا ہے جنہیں سرد ممالک کے بارہ سنگھے کھینچے اور جو ہمیشہ برف سے ڈھکے رہتے ہیں -

آزاد خود شملے میں رہ چکے تھے اور وہاں انھوں نے ایسا منظر دیکھا تھا -

اقبال اک برس جو مرا تاجِ سر ہوا   شملے میں مجھ کو موسم سرما بسر ہوا
جاڑے کے مارے چلتے ہوئے پانی تھم گئے   اور جو تھمے ہوئے تھے وہ یخ ہو کے جم گئے

اور پھر اگر اپنے ملک کی سردی کے ساتھ اگر انھوں نے ان سرد علاقوں کی سردی کو بھی بیان کر دیا ہے جہاں بارہ سنگھے گاڑی کھینچتے ہیں تو یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے - شاعری میں دوسرے ممالک کی منظر کشی میں ممانعت تو نہیں ہوتی اور پھر آزاد نے یہ تو نہیں کہا کہ ایسا ہمارے ملک میں ہوتا ہے انھوں نے بتایا ہے کہ :

گلشنِ دانش و فرہنگ جو ہے ملک فرنگ   اے زمستاں ہیں وہاں تیرے عجب عیش کے رنگ
بارہ سنگھے کہیں بگھی ہیں اڑاتے جاتے   جلوۂ تختِ ہوا دار دکھاتے جاتے

"حالی کی نظم "برکھارت" کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ اخبار پنجابی سال رواں کی ۱۸ر جولائی کی اشاعت میں اس کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے" جس نے یہ نظم نہ پڑھی ہو وہ پڑھ کر دیکھے کہ مشاعرے نے کس خوبی سے یہ تصویر بنائی ہے۔ جنہوں نے شاعر کی زبان سے اسے سُنا وہ مرحبا کہہ اٹھے اور کوئی صاحب ذوق اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وطن کی خصوصیتوں کو ایسی عمدگی سے بیان کیا ہے کہ اور کسی مثنوی میں اس کی نظیر نہ ملیگی بڑی بات یہ ہے کہ شاعر نے کوئی بے موسم کی راگنی نہیں چھیڑی اور نہ حُسن وعشق کے چرچے کئے پھر بھی اس کی سادگی و رنگینی جادو کا کام کر گئی ۱۷ ۔"

"مشاعرے کی چوتھی مجلس ۳ر اگست کو منعقد ہوئی۔ حضرات شعراء کی تعداد اب کے اور بھی زیادہ تھی۔ کئی تو دُور دُور سے آئے تھے۔ اور جو نہ آ سکے انھوں نے اپنا کلام بھیج دیا۔ اتنا وقت کہاں تھا کہ ان سب کو داد سخن ملتی اور پھر کئی تو اس پُرانی لکیر کو پیٹ رہے تھے جس کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا گیا ہے۔ ان پامال مضامین کو سُننے کی تاب کسی میں نہ تھی۔ پنجابی (۸ر اگست) نے ان شاعروں کی فہرست چھاپی ہے اور فرداً فرداً ان کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ ان میں بہت سوں کی روش نئی ہے اور کچھ ضمنی امور کو چھوڑ کر ان کی تعریف کی ہے۔ ان میں اخبار کو دہلی کے رئیس میرزا اشرف بیگ کی مثنوی نو بہار اُمید سب سے

---

۱۷ - مقالات حالی حصہ دوم ص ۳۳

زیادہ پسند آئی ۔ اس میں ۲۸۰ بیت ہیں اخبار کے ایڈیٹر نے لکھا :

"یہ ساری مثنوی اتنی مرصع ہے کہ جتنی بھی داد دی جائے کم ہے ۔ طرز بیان میں صفائی اور روش کا کمال نظر آتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ سادگی کا یہ حال ہے کہ خاص و عام سب اس سے یکساں لطف اندوز ہو سکتے ہیں ۔ ہر نکتہ ایسی استادی سے بیان کیا ہے کہ کسی بد ذوق کو بھی اس کے سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی ۔ بلند سے بلند خیال کو سادہ سے سادہ پیرائے میں ادا کیا ہے ۔ اگر ایک طرف تصویر و تخیل میں خوبصورتی ہے تو دوسری طرف تشبیہ و استعارے میں توازن ہے[۴۸] ۔"

"مشاعرے کے آخر میں صاحب صدر نے اعلان کیا کہ اگلی مجلس میں 'حب الوطن' پر نظمیں پڑھی جائیں گی" ۔

"یہ مجلس ۳ ستمبر کو لاہور میں ہوئی ۔ اس مرتبہ بھی بہت سے شاعر آئے اور جو نہ آ سکے ان کا کلام آیا پنجابی کے نقاد نے ۳ اکتوبر کے پرچے میں اس مشاعرے کا تذکرہ کیا ہے ۔ جو خود نہ آ سکے تھے ان میں دو کی اس نے خوب خبر لی ہے ۔ لیکن مولوی محمد شریف (ایڈیٹر طلسم حیرت مدراس) کی نظم کی جی کھول کر داد دی ہے ۔ لکھا ہے کہ زبان و بیان کے حسن کا جہاں تک تعلق ہے وہ دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ کی صف میں بیٹھ سکتے ہیں[۴۹] ۔"

" ان کے بعد نقاد تین مشاعروں کی بات بھی نہیں پوچھتا ۔ البتہ جب

---

۴۸ - مقالات دتاسی حصہ دوم ص ۳۳ ، ۳۴

۴۹ - ایضاً ص ۳۴ ، ۳۵

حالی کی نظم "حب وطن" کا نام آتا ہے تو وہ بتلاتا ہے کہ لوگوں نے ہمہ تن گوش اسے سُنا اور یہ محسوس کیے کہ رات بیت چکی ہے سب پر اسی کا اثر ہوا"۔

"جنہوں نے اپنا کلام پڑھ کر سنایا ان میں مولوی محمد حسین آزاد کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔ اخبار نویس کا بیان ہے کہ ان کے پڑھنے کا انداز جاذب توجہ تھا۔ لیکن نفس مضمون کو دیکھ کر اصلاح پسندوں کو ناامیدی ہوئی۔ وہی گل و بلبل کے چونچلے وہی مے و مینا کے چرچے، جنہیں شاعر سے بڑی بڑی توقعات تھیں وہ سخت مایوس ہوئے۔ اس نظم کا عنوان "صبح امید" ہے۔ اور یہ حقیقت ہے تنقید کی آنچ پر وہ کھری نہیں اترتی۔ استاد ذوق کے شاگردوں میں آزاد کو امتیاز حاصل ہے۔ اس کے باوجود وہ اس مرتبے کا مستحق نہیں جو جدید شاعری کے حامیوں نے اُسے عطا کیا ہے"[50]۔

"انجمن کے اگلے مشاعرے کا موضوع سخن "انصاف" قرار پایا۔ یہ مجلس ۱۴ نومبر کو ہوئی۔ میجر ہالرائیڈ اور متعدد ہندوستانی اہل قلم اس میں شریک تھے۔ شاعروں میں میر محمد اکبر خاور بھی تھے جنہوں نے سلطان الشعراء کا خطاب پایا ہے۔ پنجابی (دسمبر) کی رائے ہے کہ نظموں کا معیار عموماً سطحی تھا اور آزاد کا کلام تو پہلے سے بھی زیادہ گر گیا البتہ حالی کی نظم حسب دستور حاصل مشاعرہ تھی اور سچ تو یہ ہے کہ انہی کے دم سے ان محفلوں کی رونق ہے"[51]۔

۵۰۔ مقالات دتاسی حصہ دوم ص۔ ۳۵

۵۱۔ ایضاً

ساتواں مشاعرہ منعقد ۱۹ر دسمبر ۱۸۷۴ء ضمیمہ ماہ نومبر و دسمبر بعنوان مروت ہُوا۔ اس مشاعرے میں حصّہ لینے والے شعراء مندرجہ ذیل ہیں۔

"مُلا گل محمد عالی، مولوی سلطان علاء الدین، مولوی محمد شریف، مُنشی لچھمن داس برہم، مصر رام داس قابل (فارسی) مولوی عطا اللہ خاں عطا، شیخ الہی بخش درشن (بٹالہ) سید اصغر علی حقیر، مولوی عمو جان ولی، پنڈت کرشن لال طالب، مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی محمد سعید۔"[۵۲]

آٹھواں مشاعرہ منعقدہ ۳۰ر جنوری ۱۸۷۵ ضمیمہ ماہ جنوری ۷۵ء بعنوان "قناعت" اس مشاعرے میں یہ شعراء شریک ہوئے۔

"ڈاکٹر لچھمن داس برہم، ملا گل محمد عالی، مولوی سلطان علاؤ الدین صافی، لالہ تارا چند (حلوائی) لالہ دین دیال عاجز (طالب علم) شیخ مولا بخش بلند، جوالا سہائے، کائستھ خورم (طالب علم جماعت ہشتم) مصر رام داس قابل (فارسی) میاں محمد حیات فیض، میر انور حسین تمنا، مولوی عطا اللہ خاں عطا، شیخ الہی بخش رفیق، سید اصغر علی حقیر، منشی امام بخش، مولوی محمد سعید، مولوی محمد حسین آزاد اور پنڈت جواہر لال"[۵۳]

نواں مشاعرہ "تہذیب" کے عنوان سے منعقد ہُوا۔ ۱۳ مارچ ۱۸۷۵ء کے نویں مشاعرے میں سید اصغر علی حقیر لکھنوی کی مثنوی جو غیر مطبوعہ ہے اور دوسری

۵۲۔ نقوش سالنامہ جنوری ۱۹۷۷
مقالات گارساں دتاسی حصّہ دوم ص ۱۳۱، ۱۳۲۔

۵۳۔ نقوش سالنامہ جنوری ۱۹۷۷۔
مقالات گارساں دتاسی حصّہ دوم ص ۱۳۲۔

مثنوی الٰہی بخش رفیق صاحب کی ہے اور یہ مثنوی بھی غیر مطبوعہ ہے۔ گارساں دتاسی کے علاوہ اور تنقید نگاروں نے بھی اپنی تنقیدوں میں اس کا ذکر کیا ہے۔
اس مثنوی نے جلسے میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ رفیق صاحب نے اخبار پنجابی کو بے نقط سنائیں۔ اس کے علاوہ دیگر عہدیداروں، حکام، شعراء اور خاص طور پر آزاد تک نہ بچ سکے۔ اگرچہ نام نہیں لیا لیکن قرائن سے آزاد ہدف بنے۔ کیوں کہ رفیق صاحب کے علاوہ جن شعراء کا کلام اس لائق نہیں ہوتا تھا وہ محروم رہتے اور آزاد کے خلاف زہر اگلتے۔
آزاد نے اپنے ایک خط میں اس کا ذکر کیا ہے[۵۸]۔
اس مثنوی سے ظاہر ہوتا ہے کہ شعراء کی آپس کی چشمک آخر مشاعروں کو لے ڈوبی، سیاسی اعتبار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شعراء کو حکام پر سے اور دوا یک دوسرے سے اعتماد اٹھ گیا تھا، اور جو مقصد ان مشاعروں کا تھا وہ پس پشت جا پڑا۔ ویسے یہ مثنوی اس روایت کی طرف اشارہ کرتی ہے جب مشاعرے اکھاڑا بن جاتے تھے۔ کتابت کی غلطیوں کی وجہ سے بعض اشعار وزن میں نہیں رہے۔ زبان میں روانی ہے۔ اس مثنوی سے تضحیک روزگار اور انشا و مصحفی کا دور یاد آ جاتا ہے۔
دسویں مشاعرے کی تاریخ کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ بقول ڈاکٹر صفیہ تمنائی نویں مشاعرے کے غیر مطبوعہ مسودہ پر فیض کی نظم اخلاق پر ہے جس کے صرف سات اشعار تھے۔ اس مشاعرے میں یقیناً اور شعراء بھی شریک ہوں گے۔ لیکن سوائے مولانا آزاد کی مثنوی "شرافت حقیقی" جو معنوی اعتبار سے اخلاق سے منسلک ہے کسی اور شاعر کا کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔

۵۸۔ ڈاکٹر محمد صادق، مکاتیب آزاد، لاہور، ص ۷۷

انجمن کے مشاعروں نے یہ احساس دلایا کہ شاعری میں غزل کافی نہیں - نئے اصناف کی طرف توجہ دلائی - مغربی اثرات کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اسے تحریک کی شکل عطا کی - اس میں مبالغہ، انفعالیت، حزن و یاس اور قنوطیت کے بجائے حقیقت، زندگی اور جولانی، رجائیت اور مسرت کو پیش کیا جانے لگا اور لوگوں کو یہ احساس پیدا ہوگیا کہ شاعری اب محض تفنن طبع کیلئے نہیں بلکہ اسے عظیم مقصد کیلئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے -

سیاسی نقطہ نظر سے بھی ان مشاعروں کی بڑی اہمیت ہے - اہل ہند کے سامنے از سر نو زندگی شروع کرنے کیلئے صرف دو صورتیں باقی تھیں یا انگریزوں سے نبرد آزما ہوکر کھویا ہوا اقتدار حاصل کرتے یا نئے حالات سے مفاہمت پیدا کر لیتے - اہل ہند مفاہمت کیلئے تیار ہو چکے تھے - انجمن پنجاب نے نظم و نثر کے ذریعہ عوام کے اذہان کو اس مطابقت کیلئے آمادہ کر لیا -

انگریز خود تعلیم کو عام کرنے کیلئے نئے نصاب تیار کرنے کی فکر میں تھے - مقصد چاہے کچھ ہو انجمن کی سرپرستی میں ان مشاعروں کے ذریعہ جدید نظم کو استوار کر کے نئے ذہنوں کو نئے راستوں پر ڈال دیا -

انجمن پنجاب کے مشاعروں کی کاروائی ایک رسالے کی صورت میں شائع ہوتی تھی جس کا نام "گلدستۂ سخن" تھا - یہ رسالہ انجمن کے دوسرے رسائل، انجمن پنجاب اور ہمارے پنجاب وغیرہ سے الگ تھا - دہلی میں مولانا امداد صابری کے کتاب خانے میں گلدستۂ سخن کا اپریل ۱۸۸۰ء کا شمارہ موجود ہے - اس میں مختلف شعراء کی ہم ردیف و قافیہ غزلیں درج ہیں - "دولت ہوئی نصیب، قیامت ہوئی نصیب" وغیرہ - اس شمارے میں اردو کے علاوہ شعراء کا فارسی کلام بھی درج ہے - اس میں مندرجہ ذیل

شعراء کی بالترتیب غزلیں شائع ہوئی ہیں۔

شیخ الٰہی بخش رفیق، رام سہائے سہا۔ محمد ظہور الدین ظہور۔ حامد علی حامد
مولوی فیض الحسن فیض۔ قاضی فضل حسین قاضی۔ مولوی علاؤ الدین عاصی۔ غلام قادر مبارک
گنڈا رام نادان۔ قاضی محبوب عالم بلبل۔ حبیب اللہ حبیب۔ غلامی۔ محمد الدین۔
مفتی امام بخش مفتی۔ قاضی ظفر الدین ظفر، تارا چند تارا۔ منشی نثار علی شہرت، سنت رام حسرت
عطا اللہ خاں عطا۔[55]

اس سے قدیم تک شمارہ مرحوم امام خاں نوشہروی کی ملکیت تھا یہ شمارہ مارچ ۱۸۸۰ء کا ہے۔ نوشہری صاحب نے اورینٹل کالج میگزین لاہور کے نومبر ۱۹۵۲ء کے شمارے میں اس پر مقالہ لکھا ہے۔ اس شمارے پر گلدستۂ سخن عدد ۴ درج ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے تین اور شمارے شائع ہو چکے تھے۔ پرچے پر یہ بھی درج ہے کہ "حسب الارشاد ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو لائٹنر صاحب بہادر رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی کالج لاہور، مطبع انجمن پنجاب لاہور میں چھپا"۔

اس شمارے میں جن شعراء کا کلام درج ہوا ہے ان کے نام ترتیب وار درج ذیل ہیں:

بسمل: محمد یار، بسمل: فتح دین، تارا: تارا چند، چراغ: چراغ دین
حسرت: سنت رام، رفیق: الٰہی بخش، حقیر محمد سلطان مرزا، سہا:
رام سہائے، ظہور: ظہور دین، عاشق: محمد یاسین، عطا: مولوی عطا اللہ
فیض: مولوی فیض الحسن، قاضی: قاضی فضل حسین، مائل: حکم چند

۵۵۔ گلدستۂ سخن، لاہور، مطبع انجمن پنجاب، اپریل ۱۸۸۰ء

منیر : الٰہی بخش، مبصر : نثار حسین، نادان : گنڈا رام، شہرت : نثار علی،
قاری : محمد کبریا، مجید : عبدالمجید، دلی : مولوی عمو جان، ہمایوں : شاہ دین۔[56]

انجمن پنجاب کا ایک اور اہم ادبی کارنامہ اخبار انجمن پنجاب کا اجراء تھا۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی تحقیقات کے مطابق : "۱۸۶۰ء میں اس (انجمن پنجاب) کے مقاصد کو فروغ دینے اور اس کی کاروائی ارکان انجمن تک پہنچانے کیلئے ایک رسالہ جاری ہوا جس کا نام "رسالہ انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب" رکھا گیا۔ اس کا ۱۸۶۷ کا فائل پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ اس رسالے کی ادارت مولانا محمد حسین آزاد بھی کرتے تھے . . . ."

"۱۸۷۰ء میں رسالہ بند ہو گیا۔ اور اس کی جگہ "اخبار انجمن پنجاب" معرض وجود میں آیا۔[57]"

اس اخبار کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس کا سبب خورشید صاحب نے یہ بیان کیا ہے کہ سرکاری اخبار جو ۱۸۵۸ میں جاری ہوا تھا اور جو ایک زمانے میں کوہ نور کے بعد لاہور میں اردو کا بہترین اخبار مانا جاتا تھا۔ ۱۸۶۹ میں بند ہو گیا تھا۔ اور اب حکومت کو کسی ایسے اخبار کی ضرورت تھی جس پر سرکاری ٹھپہ نہ ہو اور

۵۶۔ نوشہروی، اورینٹل کالج میگزین، گلدستہ سخن نمبر ۱، لاہور۔ یونیورسٹی ۱۹۵۲
۵۷۔ صحافت پاکستان و ہند میں ص ۲۵۲، ۲۵۳

خورشید صاحب کی یہ اطلاع درست نہیں کیونکہ آغا محمد باقر بنیرہ آزاد کے ذاتی کتب خانے میں اس رسالے کا ۱۸۷۱ تک کے فائل موجود ہیں۔
دیکھئے پیش لفظ مقالات آزاد جلد اول مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور۔۱۹۶۶

اس کے باوجود سرکار کے مقاصد کو فروغ دے۔

اخبار انجمن پنجاب ۱۸۷۱ء میں جاری ہوا۔ اس سے پہلے انجمن نے ۱۸۷۰ء میں ایک اخبار ہمائے پنجاب کے نام سے جاری کیا تھا جو ایک سال کے بعد بند ہو گیا اور گارساں دتاسی کے بقول اخبار انجمن پنجاب نے ۱۸۷۱ء میں جاری ہو کر ہمائے پنجاب کی جگہ لے لی۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اخبار انجمن پنجاب کے ۱۸۷۵ سے ۱۸۷۹ تک کے متفرق پرچے دیکھے ہیں جن کی بنا پر انھوں نے اخبار انجمن کے مقاصد مندرجہ ذیل لکھے ہیں:

"اس اخبار کا اجراء انجمن پنجاب کی طرف سے ہے اس سے مقصد اصلی یہ ہے کہ ہمارے ہم وطن خیالات انگریزی اور منشائے سرکار اور سرگزشت زمانہ سے واقف ہوں اور سرکار کو دیسی لوگوں کے خیالات ظاہر ہوں تاکہ حاکم اور محکوم دونوں کو فائدہ پہنچے، اور بہبودی ملک ہو اس میں اپنے اپنے موقع پر مضامین مفصلہ ذیل درج ہوتے ہیں:

۱۔ آرٹیکل یعنی جو امور وقتاً فوقتاً غور طلب ہوں ان پر اپنی اپنی اور اہلِ ملک کی رائے۔

۲۔ ایضاً دیگر انگریزی اور دیسی اخباروں کی رائے۔

۳۔ مضامین علمی و بیان عیب و صواب کتب وغیرہ نو تصنیف شدہ۔

۴۔ حالات ممالک غیر و ذکر رسم و رواج مختلف اقوام یورپ، ایشیا افریقہ، امریکہ کا جو اب تک اس ملک کے لوگوں کو معلوم نہیں اور حال ان ممالک کی تاریخ قدیم کا۔

۵- خطوط اور خبریں۔

۶- خلاصہ قوانین و احکامات تبدیلی و تقرری وغیرہ عہدہ داران و ملازمین سرکاری۔

۷- اشتہارات مفید عام و مفید خاص۔

"اخبار انجمن پنجاب ہر جمعے کو چھپتا تھا تقطیع ۱۸x۲۶/۴ تھی اور سولہ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ ہر صفحے پر تین کالم ہوتے تھے۔ کتابت اور طباعت عمدہ ہوتی تھی۔ صفحات اول پر نام کی پٹی کے نیچے اخبار کے مقاصد اور قواعد درج ہوتے تھے اور باقی صفحات پر مضامین علمی، منقولات، مراسلات، کارسپانڈنس مختلف واقعات، ترجمہ اخبارات عربیہ، ترجمہ اخبارات انگریزی لوکل اور احکام نواب لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کے عنوان کے ماتحت دلچسپ مواد اکٹھا کر دیا جاتا تھا[۵۸]"

آغا محمد باقر صاحب بنیرہ آزاد نے اطلاع دی ہے کہ ان کے ذاتی کتب خانے میں "رسالہ انجمن پنجاب" کے مندرجہ ذیل شمارے موجود ہیں:

۱- ۱۸۶۵ء مکمل فائل۔

۲- ۱۸۶۶ء ۱۱ شمارے موجود ہیں۔ جون کا شمارہ غائب ہے

۳- ۱۸۶۷ء صرف مئی اور جون کا شمارہ نہیں ہے۔

۴- ۱۸۶۸ء مکمل فائل ہے۔

۵۸- صحافت پاکستان و ہند میں ص ۲۵۲، ۲۵۳۔

۵ - ۱۸۶۹ء مارچ، ستمبر، نومبر، دسمبر کے شمارے غائب ہیں۔

۶ - ۱۸۷۰ء مارچ، ستمبر، نومبر، دسمبر کے شمارے نہیں ہیں۔

۷ - ۱۸۷۱ء صرف جنوری، فروری، مارچ کے نمبر ہیں[۵۹]۔

اس اندراج سے جیسے کہ گذشتہ حاشیے میں عرض کیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی یہ رائے کہ "۱۸۷۰ء میں رسالہ بند ہو گیا" نظر ثانی کی محتاج قرار پاتی ہے۔ ممکن ہے ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۱ء رسالہ انجمن اور اخبار انجمن دونوں بیک وقت جاری رہے ہوں۔

اس سے پہلے کہ انجمن پنجاب کی دو اور اہم شاخوں کا ذکر کیا جائے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتایا جائے کہ انجمن پنجاب نے پنجاب اور اس کے ادب پر کیا اثر ڈالا۔ انجمن پنجاب کو محض علمی اور ادبی سطح کی تنظیم سمجھنا درست نہیں۔ انجمن پنجاب ایک اصلاحی اور رفاہی ادارہ تھا۔ جس کے دائرہ کار میں تعلیم، ادب، معاشرت اور نظم و نسق اور صنعت و تجارت بھی کچھ شامل تھا اور حکومت کی خواہش تھی کہ وہ ان تمام شعبوں میں پنجاب کو ہر اعتبار سے مضبوط اور ترقی یافتہ بنائے۔

انجمن کی اہمیت میرے نزدیک اسلیئے بھی ہے کہ اس نے اردو شاعری کے روائتی اور بے جان طرز احساس کے مقررہ سانچوں اور مخصوص طرز سے بغاوت کر کے نئے فکر اور احساس کی بنیاد ڈالی۔

اس انجمن نے داخلی فکر اور احساس کے مقابلے میں خارجی سلسلوں کے شعری معیار کو حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ انجمن کے ۱۸۷۴ء کے اعلان سے پہلے اردو شاعری صدیوں کے روائتی تصورات میں الجھی ہوئی تھی اور ایسے معاشرے کی

---

۵۹ - پیش لفظ - مقالات آزاد ص ۱۷

پیداوار تھی جس میں شعری تخلیق تقریباً ایک میکانکی چیز بن کر رہ گئی تھی۔

اب انجمن پنجاب کی دو اور اہم شاخوں کا ذکر کیا جاتا ہے جنہوں نے بالواسطہ علمی و ادبی فضا مہیا کرنے میں مدد دی۔

۱۔ انجمن اسلامیہ پنجاب لاہور۔ ۲۔ انجمن قصور۔

انجمن اسلامیہ پنجاب "شروع اکتوبر ۱۸۶۹ء (مطابق ماہ جمادی الثانی ۱۲۸۶ھ) میں قائم ہوئی"۔[۶۰] ۱۸۸۶ء کی رپورٹ میں اس انجمن کے اغراض و مقاصد اور کارنامے نمایاں پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس زمانے میں انجمن کے پریذیڈنٹ نواب نوازش علی خاں اور نواب عبدالمجید خاں تھے۔ خان بہادر محمد برکت علی خاں آنریری سیکرٹری اور مولوی محرم علی چشتی جائنٹ سیکرٹری تھے۔ رپورٹ رفیق ہند پریس لاہور میں مولوی محرم علی چشتی کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے اور اسلوب نگارش سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحریر بھی مولوی محرم علی چشتی کی ہے۔

یہ انجمن بنیادی طور پر مسلمانوں کے مذہبی اور رفاہی امور کے لئے وجود میں آئی تھی۔ لیکن اس کی ذیلی کمیٹیوں میں منتظم کمیٹی کے ساتھ ساتھ ایجوکیشنل مینجنگ کمیٹی بھی موجود تھی۔ ۱۸۸۶ء تک انجمن نے جو دینی، رفاہی اور اصلاحی خدمات انجام دی تھیں ان کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ ایام محرم میں ہندو مسلم تنازعے کا تصفیہ۔

۲۔ شاہی مسجد لاہور کی بازیابی اور مرمت۔

شاہی مسجد لاہور سکھوں کے عہد میں بارود خانہ بنی ہوئی تھی۔ اور بعض

۶۰۔ رپورٹ انجمن اسلامیہ پنجاب، لاہور، مطبع رفیق ہند، ص ۱

سکھ سرداروں نے جنگی ضرورتوں کیلئے اس کے میناروں پر مورچے بھی قائم کئے تھے جس کے سبب مسجد جگہ جگہ سے ٹوٹ چکی تھی۔ انجمن اسلامیہ نے اس کی تعمیر کا کام اپنے ہاتھ میں لیکر اہم دینی خدمات انجام دی۔ اس کارنامے کا ذکر گارساں دتاسی نے ۱۸۷۵ء کے خطبے میں بڑے تعریفی کلمات میں کیا تھا۔[61]

۳۔ سنہری مسجد، مسجد ٹکسالی دروازہ اور مسجد گمٹی بازار کی مرمت۔

۴۔ مسودہ قانون اوقاف پر مسلمانوں کے متعلق اظہار رائے۔

۵۔ انجمن کی رائے سے شہر کے فاضل اجل جناب مولوی خلیفہ حمید الدین صاحب کو سرکاری طور پر قاضی مقرر کیا گیا۔

۶۔ نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کلکتہ پر اظہار رائے۔

۷۔ کمشن تعلیم ھند پر اظہار رائے نیز شملے میں تعلیمی کمشن میں مسلمانوں کی وکالت۔

۸۔ تعلیمی کمشن کے چیرمین ڈاکٹر ھنٹر کی لاہور میں آمد پر ایڈریس پیش کیا جس میں مسلمانوں کے تعلیمی معاملات کا ذکر کیا گیا۔

۹۔ اردو زبان اور رسم الخط پر اعتراضات کا جواب۔[62]

اس انجمن نے بالواسطہ تو علمی اور ادبی فضا مہیا کرنے میں مدد دی لیکن علم و ادب کے فروغ میں براہ راست کوئی نمایاں کردار ادا نہیں کیا۔ یہ کام کسی نہ کسی صورت میں پنجاب کی دوسری اہم انجمن نے انجام دیا جس کا نام انجمن مفید عام قصور تھا اور عرف عام

۶۱۔ مقالات گارساں دتاسی حصّہ دوم۔ ص ۱۸۰

۶۲۔ رپورٹ انجمن قصور ص ۲ تا ۱۱ (سرورق کے عدم حصول کے پیش نظر مطبع کا نام معلوم نہیں ہو سکا)

میں اس کو انجمن قصور کہتے تھے۔

انجمن قصور کا قیام ۱۸۷۸ء میں عمل میں آیا۔ ۱۸۷۹ء کی چھپی ہوئی رپورٹ دہلی میں مولانا امداد صابری کے ذاتی کتاب خانے میں موجود ہے۔ ان کی عنایت سے اس رپورٹ کے فوٹو سٹیٹ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ اس رپورٹ میں بھی انجمن کے قیام اور غرض و غایت پر ایک مبہم سی تصویر کے علاوہ مفصل روشنی نہیں پڑتی۔ انجمن قصور کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس مجمع کا کام تا بمقدور ملک کی مروج زبانوں کے ذریعے سے قدیم علوم مشرقی و جدید فنون مغربی کی اشاعت کرنا اور عموماً دیسی زبان دانی کو ترقی دینا اور جہاں تک ہو سکے ملک کی بہبودی و ترقی عزت و دولت و تہذیب و درستی نیت میں سعی کرنا ..."[۶۳]

جیسا کہ مقاصد کے اقتباس سے ظاہر ہوا۔ انجمن قصور ایک نیم ادبی و رفاہی ادارہ تھا۔ اس انجمن کو اگر ایک طرف حکومت کے اعلیٰ حکام کی سرپرستی اور امداد حاصل تھی تو دوسری طرف پنجاب کے نام آور صاحب قلم کا علمی تعاون بھی حاصل تھا۔ ۱۸۷۹ء کی مطبوعہ رپورٹ میں جن حکام کی تعریفی آراء شائع کی گئی ہیں ان میں سر رابرٹ ایجرٹن لفٹیننٹ گورنر پنجاب، جی۔ بی لائل فنانشل کمشنر پنجاب، میجر الفرڈ ہارکوٹ ڈپٹی کمشنر لاہور اور ڈ۔ جی بارکلے قائم مقام کمشنر لاہور شامل ہیں۔

انجمن قصور نے اپنے مقاصد کی پہلی شق یعنی "ملک کی مروج زبانوں کے ذریعے سے قدیم علوم مشرقی و جدید فنون مغربی کی اشاعت کرنا" کی تکمیل میں دو اقدام کیے۔

۶۳۔ رپورٹ انجمن قصور۔ ۱۸۷۹، ص ۳۔

۱۔ انجمن کے تحت انگریزی اور فارسی زبان کے مدرسے کا اجراء۔
۲۔ رسالہ انجمن قصور کی اشاعت۔

رپورٹ ۱۸۷۹ء کی دفعہ نمبر ۶ میں انگریزی، فارسی زبان کے مدرسے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس میں کوئی انکار کی وجہ نہیں کہ ہر قسم کی شائستگی اور آسودہ حالی کا منبع اور مخرج تعلیم ہے۔ اسلئے مجلس نے اس سال میں مدرسہ تعلیمی کی ان دقتوں اور بے انتظامیوں کو بھی منع فرما دیا جو پچھلے سال میں بعض بعض مشکلوں اور تغیر و تبدل معلموں کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئی تھیں اور ان کی نگرانی میں کافی توجہ مبذول فرمائی چنانچہ اس سال میں طلباء میں بھی بہت کچھ ترقی ہوئی۔ اور لائق طالب علموں کی تعداد بھی بہم پہنچائی گئی۔ نام اور تعداد معلموں کی متعلموں کا نقشہ ضمیمہ نمبر "ھ" "و" متعلقہ دفعہ "۶" سے واضح ہوتا ہے۔"[۶۴]

جس ضمیمے کا اس اقتباس میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی رو سے طلباء کی کل تعداد ۱۹۲ اور گیارہ افراد عملے میں شامل ہیں۔ ان میں لالہ بدری ناتھ سکول کے ہیڈ ماسٹر بابو لودھی سنگھ، سیکنڈ ماسٹر مولوی زمان الدین، مولوی امام الدین اور مولوی خیرالدین فارسی کے، پنڈت کنھیا لعل سنسکرت کے اور منشی ارجن داس و میاں غلام محمد انگریزی کے استاد تھے۔

انگریزی اور فارسی کے مدرسے کے علاوہ ایک اہم مدرسہ جس کے سبب سے انجمن قصور کی

۶۴۔ رپورٹ انجمن قصور ۱۸۷۹ ص۔ ۶

اصلی شہرت تھی صنعتکاری کا مدرسہ تھا ۔ معاصر اخبارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مدرسے کے حکام وقت کی نظر میں خاص وقعت تھی اس مدرسے میں قالین بافی، زری بافی، زین سازی اور لنگی بافی کے کام خاص طور پر سکھائے جاتے تھے ۔ اور سال کے بعد طالب علموں کو سندیں اور انعامات دیئے جاتے تھے ۔

انجمن قصور کی ادبی خدمات کے ضمن میں اس ماہوار رسالے کا ذکر ضروری ہے اس رسالے کا نام رسالہ انجمن قصور تھا ۔ اس کے ادارتی عملے میں مختلف اوقات میں مختلف اہل قلم نظر آتے ہیں ۔ ابتدا میں انجمن کے سیکریٹری مولوی مرزا فتح محمد بیگ تھے ۔ پھر کچھ عرصہ میر نثار علی شہرت بھی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے ۔ مرزا فتح محمد بیگ اپنے عہد کے ممتاز اہل قلم میں شمار ہوتے تھے ۔ انداز تحریر وہی تھا جو انجمن پنجاب سے وابستہ یا پنجاب کے دوسرے اہل قلم کا تھا ۔ مرزا فتح محمد سرسید کے پر زور حمایتی تھے ۔ چنانچہ ۱۸۷۹ء کی رپورٹ سرسید کی تعریفوں سے بھری ہے ۔ پنجاب اور ہندوستان کے اکثر اخبار جب سرسید کے مذہبی خیالات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے تھے اس وقت بھی رسالہ انجمن قصور سرسید کی حمایت میں رطب اللسان تھا ۔

رسالہ انجمن قصور کو وقتاً فوقتاً جن نامور اہل قلم کا ادبی تعاون حاصل رہا ان میں سرسید احمد خاں، مولوی محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، منشی رادھا کشن، لالہ سرسکھ رائے، مرزا افضل بیگ مختار اور میر نثار علی شہرت کے نام قابلِ ذکر ہیں ۔

مولانا محمد حسین آزاد کا ایک مقالہ "نظم اردو کی تاریخ" دسمبر ۱۸۷۴ء کے پرچے میں اور دوسرا "انگریزی شاعری پر کچھ خیالات" مئی ۱۸۷۵ء کے شمارے میں درج ہے[۶۵] ۔

---

۶۵ - پیش لفظ مقالات آزاد ص ۱۷

مولانا الطاف حسین حالی کا لیکچر بعنوان "قومی ہمدردی" اپریل ۱۸۷۶ء کے شمارے میں مرزا فتح محمد بیگ کے ادارتی نوٹ کیساتھ شائع ہوا۔ اس لیکچر پر مرزا صاحب نے جابجا حواشی بھی اضافہ کئے[۶۶]۔

آغا محمد باقر صاحب بنیرۂ آزاد کے ذاتی کتب خانے میں رسالہ انجمن قصور کے مندرجہ ذیل فائل موجود ہیں:

۱۸۷۴ء جولائی و اگست یکجا، ستمبر و اکتوبر یکجا۔ دسمبر موجود باقی ندارد۔

۱۸۷۵ء شمارہ اپریل ہیں باقی موجود ہے۔

۱۸۷۶ء صرف فروری اور نومبر کے شمارے نہیں ہیں۔

۱۸۷۷ء جنوری سے لیکر جون تک چھ شمارے موجود ہیں[۶۷]۔

اس کے علاوہ دہلی میں مولانا امداد صابری کے ذاتی کتاب خانے میں رسالہ انجمن مفید عام قصور کے ۱۸۷۱ء اور ۱۸۷۹ء کے فائل موجود ہیں[۶۸]۔

دسمبر ۱۸۷۹ء کے شمارے میں ایڈیٹر مرزا فتح محمد بیگ نے مسدس حالی پر ریویو لکھا ہے جسمیں سر سیّد احمد خاں کا ذکر کرتے ہوئے انھیں "مہدی زماں" کے کلمات سے یاد کیا گیا ہے۔

ان دو انجمنوں کے علاوہ گارساں دتاسی نے پنجاب کی ایک اور اہم ادبی انجمن کا ذکر

۶۶۔ شیخ اسمٰعیل پانی پتی، مجموعۂ نثر حالی جلد دوم، لاہور مجلس ترقی ادب، نومبر ۱۹۶۸ ص ۳۔

۶۷۔ پیش لفظ۔ مقالات آزاد حصّۂ اول ص ۱۷

۶۸۔ میں مولانا امداد صابری کی احسان مند ہوں کہ انھوں نے اگست ۱۹۷۸ میں میرے سفر دہلی کے دوران ان قیمتی فائلوں کو دیکھنے کی مجھے اجازت فرمائی۔

اپنے ۱۸۷۲ء کے مقالے میں کیا ہے۔ جس کا نام "ادبی انجمن بٹالہ" تھا۔ بٹالہ دور قدیم سے اردو ادب کا مرکز رہا ہے۔ سلسلۂ فاضلیہ کے درویشوں کی اردو خدمات کا ذکر حافظ محمود شیرانی کی مشہور کتاب "پنجاب میں اردو کی زینت" ہے۔ افسوس ہے کہ گارساں دتاسی کے مختصر بیان کے علاوہ کسی دوسرے ماخذ سے اس انجمن کے ادبی کارناموں کی تفصیل مہیا نہ ہو سکی۔ دتاسی نے لکھا ہے:

"بٹالہ (پنجاب) میں ایک ادبی انجمن، لاہور اور علی گڑھ کی انجمن کے طرز پر قائم کی گئی ہے۔ اس انجمن کا ایک اخبار بھی نکلتا ہے جس کے مدیر لکشمی سہائے ہیں جو انجمن کے معتمد بھی ہیں[۴۹]"۔

اس کے علاوہ انجمن اتحاد اور اس کے مشاعرے اور انجمن حمایت الاسلام نے بھی اردو کی ترویج میں کافی کردار ادا کیا۔ ان کا تذکرہ آئندہ باب میں آئے گا۔

ادبی انجمنوں کے تذکرے کے بعد اس دور کے اہم ادیبوں اور بعض نامور شاعروں کے سوانحی خاکے پیش کرنا بے جا نہ ہو گا۔ جن لکھنے والوں نے اس دور کے ادبی ماحول کو متاثر کیا یا اردو ادب کے دائرہ عمل کو وسیع کرنے میں نمایاں کوششیں انجام دیں ان کے نہایت مختصر کوائف درج ذیل ہیں:

۱۔ ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو لائٹنر:

"ڈاکٹر گوٹلیب ولیم لائٹنر بڈاپسٹ ہنگری میں ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے ان کے والد فزیشن تھے۔ ۱۸۴۷ء میں ترکی گئے۔ مالٹا پروٹسٹنٹ کالج میں تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ قسطنطنیہ کے مدرسۃ العلوم اسلامی میں رہے ۱۸۶۱ء میں کنگز کالج لندن میں عربی

۴۹۔ مقالات گارساں دتاسی، ۱۹۴۳ء، ص ۲۶۷

زبان و ادبیات اور اسلامی قانون کے پروفیسر مقرر ہوئے ۔ ۱۸۶۴ء میں
گورنمنٹ کالج لاہور کے قیام پر کالج کے پہلے پرنسپل مقرر کئے گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۱ ۔ جنوری
۱۸۶۵ء کو انجمن پنجاب کی بنا ڈالی ۔ ۱۸۶۹ ۔ ۱۸۷۰ء میں پنجاب کالج کا قیام عمل
میں آیا ۔ ڈاکٹر لائٹنر یونیورسٹی کالج کے پہلے رجسٹرار اور اورینٹل کالج کے پہلے
پرنسپل مقرر ہوئے ۔ ۱۸۷۶ء میں انہوں نے لارڈ لسٹن سے پنجاب یونیورسٹی
کالج کو مکمل یونیورسٹی بنانے کا وعدہ لیا ۔ جس کی توثیق ۱۸۷۷ کے شاہی
دربار میں کی گئی ۔
۱۸۸۲ء میں پنجاب کو مکمل اور با اختیار یونیورسٹی مل گئی ۔ ڈاکٹر لائٹنر
پنجاب یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۸۸۷ء میں (جبکہ وہ
رخصت پر یورپ جا چکے تھے) اپنے مناصب سے سبکدوش ہو گئے ۔
سبکدوش ہونے کے بعد ان کا قیام انگلستان میں تھا جہاں انھوں نے
اورینٹل انسٹی ٹیوٹ قائم کیا ۔ ڈاکٹر لائٹنر نے ۲۲ ۔ مارچ ۱۸۹۹ کو بون
(جرمنی) میں وفات پائی [۷۰]" ۔

ڈاکٹر لائٹنر کی اردو تالیفات میں عربی صرف و نحو اور سنین اسلام کے نام قابل ذکر ہیں ۔ سنین اسلام، مطبع انجمن پنجاب سے شائع ہوئی تھی ۔ پہلا حصہ ۱۸۷۱ء میں اور دوسرا حصہ ۱۸۷۶ء میں تالیف ہوا ۔ انجمن پنجاب کی رپورٹ متعلقہ ۸۲ ۔ ۱۸۸۱ء کے مطابق ڈاکٹر لائٹنر نے انجمن کے جلسوں میں وقتاً فوقتاً مندرجہ ذیل مقالات اردو میں پیش کئے ۔

۱ ۔ کیا سنی مسلمان دنیا کیلئے سلطان ترکیہ خلیفہ ہیں ۔

---

۷۰ ۔ تاریخ اورینٹل کالج ص ۱۲۱ تا ۱۲۷

۲- شال بافی میں استعمال ہونے والے خاص ہندسوں اور رنگوں کا نقشہ۔

۳- پنجاب کی نمائندہ کونسل۔

۴- دیسی سول سروس۔

۵- دیسی نوجوانوں کو انگلستان بھیجنے کے خطرات۔

۶- تعلیمی کمشن اور انجمن پنجاب[۷۱]۔

۲- مولانا محمد حسین آزاد:

۱۸۳۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی اردو اخبار کے مالک و مدیر مولوی محمد باقر کے بیٹے تھے جنہیں انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بغاوت پھیلانے کے الزام میں شہید کر دیا تھا۔ آزاد ۱۸۶۴ء میں وارد لاہور ہوئے پہلے ڈاکخانے اور بعد میں سررشتہ تعلیم کی ملازمت اختیار کی۔ ۵ جولائی ۱۸۶۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور کے اسسٹنٹ پروفیسر عربی مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۷ء میں انہیں شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔ ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ کو انتقال ہوا اور کربلا گامے شاہ لاہور میں دفن ہوئے[۷۲]۔

مولانا آزاد انجمن پنجاب کے پایہ گزار اور بنیادی ارکان میں سے تھے۔ انجمن میں کچھ عرصہ لیکچرار کے طور پر ملازم بھی رہے۔ انجمن ہی کے پلیٹ فارم سے نئی شاعری پر وہ معرکہ آرا تقریر کی جو اردو ادب میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔

مولانا آزاد کی اکثر تصانیف اردو میں ہیں۔ ان تصانیف میں دربار اکبری، نیرنگ خیال سخندان فارس، آب حیات اور قصص ہند قابل ذکر ہیں۔ آخری دور کے چھوٹے چھوٹے

۷۱- اشفاق انور، صحیفہ، رپورٹ انجمن پنجاب ۱۸۸۲ء، ۱۸۱، لاہور، جولائی ۱۹۶۷

۷۲- گوہر نوشاہی (تحقیقی مقالہ) اردو شاعری میں لاہور کا حصہ۔ لاہور، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، ص ۴

رسائل الہیات، سپاک و نماک، جانورستان وغیرہ آپکے بیٹوں نے شائع کئے۔ "مقالات مولانا محمد حسین آزاد حصہ اول" کے نام سے ۱۹۶۶ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع ہوا۔ شاعری کا مجموعہ "نظم آزاد" کے نام سے مشہور ہے[۷۳]۔

۳۔ مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی:

۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ مقامی اساتذہ سے عربی و فارسی تعلیم حاصل کی ۱۸۵۷ء کے بعد محکمہ تعلیم پنجاب میں ناظر ادبی کی حیثیت سے ملازم ہوکر لاہور آ گئے۔ اور ۱۸۷۳ء تک یہیں رہے۔ ۱۸۷۵ء میں دہلی چلے گئے ۱۸۸۹ء میں پھر لاہور آئے اور ایچیسن کالج میں ملازمت کی۔ لیکن ذاتی مجبوریوں کی بنا پر مستعفی ہوکر واپس چلے گئے۔ ۱۹۰۳ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۹۱۴ء میں اپنے وطن پانی پت میں فوت ہوئے[۷۴]۔

تصانیف میں مقدمہ شعر و شاعری، دیوان حالی، حیات جاوید، حیات سعدی یادگار غالب اور مبادی علم جیولوجی مشہور ہیں۔

مقالات کا مجموعہ جناب شیخ اسماعیل پانی پتی مرحوم نے "کلیات نثر حالی" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ دونوں کتابیں مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع ہوئی ہیں۔

۷۳۔ آزاد کے سوانح اور ادبی خدمات پر بے شمار کتابیں اور مضامین موجود ہیں لیکن تحقیقی اعتبار سے ان سب میں وقیع اور قابل اعتماد ڈاکٹر محمد صادق کی تالیفات بنام "محمد حسین آزاد — احوال و آثار" اور "آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین" ہیں۔ یہ دونوں کتابیں مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع ہو چکی ہیں۔

۷۴۔ مولانا امداد صابری، حیات آشوب، دہلی، یونین پریس جامع مسجد، ۱۹۵۶ء۔

۴ - پیارے لال آشوب :

ماسٹر پیارے لال آشوب دہلوی ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ مولوی امام بخش اور میرزا غالب کے دوستوں میں سے تھے۔ ۱۸۶۹ء کے قریب پنجاب میں آئے بقول لالہ سری رام مولف خمخانۂ جاوید لاہور میں پندرہ سولہ برس تک سررشتہ تعلیم میں کیوائیر رہے۔ مولانا امداد صابری کی تصنیف حیات آشوب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ماسٹر صاحب پہلے محکمہ تعلیم کے پنجاب بکڈپو میں مترجم تھے۔ ہر سرکاری اخبار اور اتالیق پنجاب کے ایڈیٹر رہے۔ پھر کیوریٹر ہوئے اور آخر میں پٹیالہ کے محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ ماسٹر پیارے لال آشوب ۲۸ مئی ۱۸۱۴ء میں فوت ہوئے۔ تصانیف میں بے شمار ادبی اور سماجی مقالات کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں اردو میں یادگار ہیں۔ ۱۔ قصص ہند حصہ اول وسوم۔ ۲۔ تاریخ انگلستان۔ ۳۔ رسوم ہند کا ابتدائی حصہ۔ ۴۔ دربار قیصری[۷۵]۔

نثر کے علاوہ ماسٹر پیارے لال جیسا کہ آشوب تخلص سے ظاہر ہے اردو میں کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ اگرچہ اشعار کی مقدار بہت ہی کم ہے تاہم لالہ سری رام نے خمخانۂ جاوید میں آشوب کے ذکر میں ان کی ایک غزل نمونے کے طور پر درج کر دی ہے[۷۶]۔

۵ - مولانا فیض الحسن سہارنپوری :

۱۸۱۶ء میں سہارنپور کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد

---

۷۵ - مولانا امداد صابری، حیات آشوب، دہلی، یونین پریس جامع مسجد ۱۹۵۶ء ص ۱۰۸ تا ۱۵۰

۷۶ - خمخانہ جاوید جلد اول ص ۸۴

خلیفہ علی بخش ایک عالم فاضل بزرگ تھے ۔ مولانا فضل حق خیر آبادی سے معقولات و ادبیات کے اسباق پڑھے ۔ مولانا امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن، اسد اللہ خاں غالب اور ابراہیم ذوق کی شعری محفلوں میں شریک رہے ۔ شاعری میں امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے ۔ ۱۸۷۰ء میں شعبہ عربی و سپرنٹنڈنٹ تحقیق و تصنیف کی حیثیت سے اورینٹل کالج لاہور میں آگئے ۔ اورینٹل کالج میں مولانا نے درس تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا ۔ ۱۸۷۱ میں انہوں نے سینس اسلام کی تالیف میں ڈاکٹر لائیٹز کا ہاتھ بٹایا ۔ شرح سبعہ (عربی، فارسی، اردو) شرح حماسہ، رشدیہ، فیضیہ (علم مناظرہ اردو) کی تالیف کے علاوہ دیوان حسان مرتب کیا۔[۷۷]

لاہور میں مولانا کا قیام بازارِ حکیماں میں تھا ۔ مولانا فیض الحسن اورینٹل کالج کے ماہوار علمی رسالے شفاء الصدور کے مدیر بھی تھے ۔ ۶ فروری ۱۸۸۷ کو ان کی وفات ہوئی ۔ سید سلیمان ندوی نے انہیں امام الادب کے نام سے یاد کیا ہے ۔ انجمن پنجاب کے سرگرم رکن تھے ۔ مشاعروں میں آزاد سے اکثر نوک جھونک رہتی تھی۔[۷۸]

۶ ۔ میر نثار علی شہرت :

میر صاحب دہلی کے رہنے والے تھے ۔ لیکن ۱۸۵۷ کے بعد پنجاب میں آگئے تھے ۔ آپ پنجاب میں مختلف اخباروں کے ایڈیٹر رہے ۔

---

۷۷ ۔ تاریخ اورینٹل کالج ص ۲۸ تا ۱۳۰

۷۸ ۔ محمد عبداللہ قریشی، سہ ماہی اقبال، حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں لاہور ۱۹۵۴ ۔

کوہِ نور، اخبار انجمن پنجاب ، اخبار انجمن قصور پنجاب وغیرہ ۔
عرصہ دراز تک محکمہ تعلیم ریاست جموں و کشمیر کے ڈائرکٹر بھی رہے۔
شاعری میں حکیم مولا بخش قلق کے شاگرد تھے ۔ ۱۹۲۰ کے قریب
اِنتقال ہُوا ۔

O

چوتھا باب

۱۸۸۲ء سے ۱۹۱۴ء تک

چوتھا باب:

۱۸۸۲ء سے ۱۹۱۴ء تک

اس دور کے جملہ سیاسی کوائف میں سے دو اہم واقعات کا بیان پس منظر کے طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ان واقعات نے نہ صرف اہلِ پنجاب کی عام زندگی کو متاثر کیا بلکہ اس عہد کے ادب میں بھی ان کی گونج سنائی دیتی ہے۔

۱۔ هندو مسلم فسادات۔ اور مسلمان مفکرین کی اصلاحی تحریکیں۔

۲۔ ملکۂ انگلستان کی جوبلی کا جشن۔

بے محل نہ ہوگا اگر ان واقعات کو ذرا تفصیل کیساتھ بیان کیا جائے۔ ہندو مسلم فسادات کی تفصیل معاصر اخباروں میں موجود ہے۔ یہاں تک کہ — The Choronology of Modern India کے مصنف Burgess نے بھی کئی مقامات پر اسے ملک کے اہم حوادث میں جگہ دی ہے۔ چنانچہ ۲۸ر جولائی ۱۸۸۲ء کے اندراج کے تحت لکھا ہے:

> "A Hindu procession at Salem stopped opposite a Mosque with a band playing in defiance of custom, the Mohammadans raised a riot: two Mohammadans killed, and about 150 of both parties wounded."[1]

اسی طرح ۱۶ر اگست کے واقعات میں درج ہے:

> "Mohammadans feast of Id-ul-Fiter. The Hindus attacked Mohammadans in a Mosque, burnt it, sacked and burnt three houses and killed several, women and children included."[2]

1-2- James Burgess, the choronology of Modern India, 1494 to 1894, PP.407.

معاصر اخبارات میں "رفیق ہند لاہور کی شہادت صرف اسی لئے اہم نہیں ہے کہ اسے صحیح معنوں میں مسلمانوں کا جریدہ ہونے کا فخر حاصل ہے بلکہ اسلئے بھی کہ اس اخبار کی پالیسی آزاد اور کافی حد تک غیر جانبدار ہے۔ یہ اختلافات ۱۸۸۴ء میں لبطور خصوصی دکھائی دیتے ہیں۔ مختلف مصلحین نے ان فسادات کے سد باب کیلئے ہندو مسلم اتحاد کو اپنے تبلیغاتی پروگرام کا حصہ بنایا۔ پنجاب کے ممتاز سیاسی رہنما اور سماجی کارکن سردار دیال سنگھ مجیٹھیہ کا قومی اتحاد پر لیکچر ۱۸۷۵ء میں وکیل ہندوستان پریس امرتسر سے شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان "نظام قومی" ہے۔ ۱۸۸۴ء کے قریب ہندو مسلم اختلافات کی موجودگی سرسید احمد خاں کی پنجاب میں مختلف تقریروں سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ سرسید جب ۱۸۸۴ء میں پنجاب کے دوسرے دورے پر آئے تو ان کی تقریروں کے دیگر اہم موضوعات میں ایک قابلِ ذکر موضوع ہندو مسلم اتحاد بھی تھا یہاں تک کہ سرسید نے لفظ ہندو کو باشندہ ہندوستان کے معنوں میں لیکر اصرار کیا کہ خود انھیں بھی ہندو کہا جائے چنانچہ لاہور میں ہندو سبھا کے ارکان سے گفتگو کے دوران سرسید نے کہا:

> "آپ نے جو لفظ ہندو کا استعمال فرمایا ہے، میری رائے میں درست نہیں بلکہ ہر ایک شخص ہندوستان کا رہنے والا اپنے تئیں ہندو کہہ سکتا ہے۔ پس مجھے نہایت افسوس ہے کہ آپ مجھکو، باوجود اس کے کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں، ہندو نہیں سمجھتے"[۳]۔

سرسید کے ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد وطن پرستی، تمدن یا معاشرت کے اصولوں پر

۳- مولوی سید اقبال علی: سرسید کا سفرنامہ پنجاب، لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۷۳ء ص ۱۹۰

نہیں تھی ۔ بلکہ سراسر سیاسی مفاد کے تحت تھی ۔ اس کے برعکس ہندوؤں کو انگریزی سیاست میں پوری پوری قومی اور مذہبی آزادی مُیسّر تھی ۔ لہٰذا سرسیّد کے با احترام پنجاب سے رُخصت ہوتے ہی ہندو مُسلم نفاق کا لاوا دوبارہ پھُوٹ پڑا ۔ رفیق ہند جسے مُسلمان اپنا قومی اخبار اور ہندو رفیق المسلمین کہتے تھے ان تخریب کارانہ کارروائیوں کی تفصیل مہیا کرتا ہے ۔

اس جگہ ان تمام واقعات کو تفصیلی طور پر پیش کرنے کی گنجائش نہیں البتہ بطور مُختصر یُوں کہا جا سکتا ہے کہ ہندو مُسلم فسادات ۱۸۸۵ء میں شرُوع ہُوئے اور ان کا بڑا مرکز پنجاب تھا ۔ چنانچہ ہفتہ وار رفیق ہند کی ۱۷ر اکتوبر ۱۸۸۵ کی اشاعت میں اس فساد کا ذکر ہے جو لاہور میں رونما ہُوا ۔ اس سے اگلی یعنی ۲۴ر اکتوبر سال مذکور کی اشاعت میں اس فساد پر ایڈیٹر کی طرف سے مفصل اداریہ مقالہ موجود ہے جسمیں ہنگامے کی وجوہ کو شرح و لبسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ۔

فساد کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ ۱۸۸۵ء میں عشرہ محرم اور رام لیلا کے تہوار اکھٹے آ گئے رفیق ھند کے بیان کے مطابق ۔

> "۱۵ر اکتوبر شام کے پہلے سے شہر کے مُختلف حِصّوں میں ھندو مسلمانوں کے فساد شرُوع ہو گئے یہاں تک کہ مُسلمانوں کی سبیلیں توڑدی گئیں اور ھندو مُسلمان دونوں زخمی ہُوئے ۔ رات بھر یہی فساد کی آگ بڑھتی رہی"[۴]

رفیق ھند مُسلمانوں کی طرف داری کے ساتھ ساتھ نفرت کی اس آگ کو بُجھانے کی

---

۴ ۔ رفیق ھند، لاھور، ۱۷ر اکتوبر ۱۸۸۵، ص ۱۴ ۔

بھی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن ہندو اخبارات کا رویہ بالکل برعکس ہے ــــ ان اخباروں نے اس ہنگامے کی آڑ میں مسلمانوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کیا۔ اس کی تفصیل بھی رفیق ھند کے ۲۴ر اکتوبر ۱۸۸۵ء کے شمارے میں "بعض ہندو اخبارات کے مفسدہ انگیز مضامین" کے تحت درج ہے۔ ان اخبارات میں بھارت جیون (بنارس) خیرخواہ کشمیر (لاہور) غمخوار ھند (لاہور) وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ جن میں اشتعال انگیز مضامین بطور خاص شائع کئے گئے۔ ہنگامہ لاہور کے ملزموں کو سزائیں ملیں۔ لیکن چونکہ اکثر مجسٹریٹ ہندو تھے لہٰذا مسلمانوں کا زیرِ عتاب آنا واضح تھا۔

۱۸۸۶ء میں پھر اتفاق سے دوسہرہ اور محرم اکٹھے آگئے۔ چنانچہ رفیق ھند ۲۸ر اگست ۱۸۸۶ء کے مطابق۔

> "سرجن سنگھ حلوائی کی دکان کے قریب ہندو مسلمانوں کی آپس میں خوب لڑائی ہوئی۔ دنگہ ہوا اور فساد ہوا۔ ایک مسلمان الیا سخت مجروح لاہور کی کوتوالی میں پیش کیا گیا جس کی امید زلیست قریباً منقطع ہوچکی تھی[۵]۔"

اسی سال ستمبر کے مہینے میں انبالہ اور لدھیانہ میں فساد ہوئے۔ انبالہ میں "عید قربان کی تقریب پر چند مسلمان جو شہر کے باہر سے گوشت لئے چلے آتے تھے ان پر ھندو حملہ آور ہوئے" اور لدھیانے میں "بنائے فساد یہ ہے کہ ایک مسلمان نے گائے کو ذبح کرنے کے واسطے تیار کیا۔

۵ـ رفیق ھند لاہور، ۱۷ر اکتوبر ۱۸۸۵ء ص ۷

اہلِ ہنود نے ان کے گھر جا کر مداخلت کی۔ بنابریں فساد اور طرفین کا نقصان ہوا[6]۔"

رفیق ہند کے ایڈیٹر مولوی محرم علی چشتی نے ۲۵ ستمبر کے پرچے میں ان دونوں فسادات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ جسمیں ایک انگریز چشم دید گواہ کی زبانی ہندوؤں کے خلاف بارہ نکات پیش کئے ہیں۔ اسی سال اکتوبر کے مہینے میں "اٹاوہ" فسادات کا مرکز بنا۔ ان فسادات کا سبب بھی عشرہ محرم میں ہندوؤں کی بے احترامی اور اشتعال انگیزی تھا۔ ۱۹ اکتوبر ۱۸۸۶ء کو دسویں محرم تھی۔ اس دن ہوشیار پور میں بھی ایک بھاری فساد رونما ہوا۔ جس کی تفصیل ایک مراسلے کے ذریعے رفیق ہند لاہور کے ۱۶ اکتوبر ۱۸۸۶ء کے شمارے میں موجود ہے۔ ہوشیار پور کا فساد اس قدر زبردست تھا کہ ۲۳ اکتوبر کے اخبار مذکور میں "ہوشیار پور سے درد ناک چیخیں" کے عنوان سے ایک مفصل مقالہ ایڈیٹر اخبار محرم علی چشتی کے قلم سے شائع ہوا ہے۔

ان فسادات نے اردو ادب کو قومی موضوعات پر تحریروں کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ دیا۔ رفیق ہند کی ۱۸۸۶ء کی جلد میں مندرجہ ذیل مقالات اپنی علمی اور ادبی حیثیت کے اعتبار سے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔	ہندو مسلمان اور گورنمنٹ	مولوی محرم علی چشتی	۲ اکتوبر
۲۔	ہندو مسلمان اور گورنمنٹ	شیخ	۲۳ "
۳۔	ہندو مسلمان اور گورنمنٹ	صلح جو (کانپور)	۱۸ دسمبر

۶۔ رفیق ہند، لاہور، ستمبر ۱۸۵۵ء ص ۳، ۱۰

۴ - دہلی کا فساد قدسی (نقل از اخبار صحیفہ قدسی)

۵ - گاؤکشی اور ہندو مسلمانوں میں مقدمے ۶ر نومبر ص : ج[7]

ان مذہبی اختلافات کے ردِ عمل میں اصلاح معاشرہ کی کچھ اہم تحریکیں بھی رونما ہوئیں ۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق اور دوسرے ادبی وسائل سے اصلاح معاشرہ پر جو بصیرت افروز مضامین لکھے ان سے اہل پنجاب کو بھی تحریک ہوئی ۔ سرسید کے اصلاحی مشن کو لبیک کہتے ہوئے جو اہم ادبی کارنامہ اہلِ پنجاب نے انجام دیا وہ مسدس حالی کی صورت میں اردو ادب کا لازوال شاہکار ہے ۔ مسدس حالی کی پیروی میں چھوٹی چھوٹی بے شمار اصلاحی نظمیں لکھی گئیں جو معاصر اخبارات و جرائد کی زینت بنیں ۔ ان اصلاحی تحریکوں کا سلسلہ اس عظیم مسلم تحریک سے ملایا جا سکتا ہے ۔ جس کے بانی سید احمد شہید تھے ۔ یہ اصلاحی تحریکیں اور ان سے پیدا ہونے والا اردو ادب اس دور کے ہندوستان میں مسلم قومیت اور تمدن کی حیات تازہ کا آئینہ دار ہے[8] ۔

ملکہ وکٹوریہ قیصر ہند کی جوبلی فروری ۱۸۸۷ء میں منائی گئی ۔ جوبلی کی تقریبات ہندوستان کے تمام شہروں میں منعقد ہوئیں ۔ پنجاب میں اس تقریب کو منانے کیلئے سب کمیٹیاں قائم کی گئیں ۔ جن کے صدر پنجاب کے عمائدین تھے ۔ جشن

---

۷ - رفیق ہند، لاہور، ۱۸۸۶ء

۸ - تفصیل کیلئے دیکھئے :

ڈاکٹر ناظر حسن زیدی، مومن دہلوی (مقالہ ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی) لاہور، پنجاب یونیورسٹی ۔ ۱۹۶۳

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، اردو ادب کا سیاسی و سماجی پس منظر (مقالہ ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی) لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۰

جوبلی کے سب سے اہم کارکن سر سید احمد خاں تھے۔ پنجاب کے اخبارات میں جشن کی کارروائیاں سر سید ہی کے افتتاحی مقالات سے شروع ہوئیں۔ ہفتہ دار رفیق ہند لاہور کا ۱۸۸۷ء کا فائل اس جشن کی پنجاب میں بھرپور تفصیلات پیش کرتا ہے۔ اس کے مختلف شماروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ پنجاب میں جوبلی کی تیاریاں جنوری ۱۸۸۷ء سے شروع ہو چکی تھیں۔ چنانچہ ۲۹ فروری ۱۸۸۷ کے شمارے میں سر سید کا مقالہ "مبارک باد جشن جوبلی" منقولات کے کالم میں درج ہے، جو غالباً علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے لیا گیا ہوگا۔

لاہور میں جوبلی کے جشن کی پہلی خبر ۲۹ جنوری کے ہی رفیق ہند میں لوکل خبروں کے ذیل میں لکھا ہے کہ:

"لاہور میں جیوبلی کا جشن منانے کیلئے مختلف قسم کی تجاویز ہو رہی ہیں اور مختلف کمیٹیوں اور سوسائٹیوں کے جلسے ہو رہے ہیں۔ پرسوں تک غالباً حضور نواب لفٹیننٹ گورنر صاحب بہادر بھی شمولیت جشن جوبلی کے لئے تشریف لے آئیں گے۔ ایک عام جلسہ باشندگان شہر کا اس امر کی تجویز کیلئے ہوگا کہ کونسا مناسب طریقہ اس اظہار مسرت کا ہے۔ اور حضور ممدوح اس جلسہ کے پریذیڈنٹ ہوں گے۔ بعض کا خیال ہے کہ ٹیکنیکل ایجوکیشن (تعلیم صنعت و حرفت) کی طرف توجہ کرنا مفید ہوگا۔ بعض لیڈی ڈفرن فنڈ کو مقدم سمجھتے ہیں اور بعض پنجاب ایسوسی ایشن کے متعلق تعلیم مستورات کی تجویز انسب تر خیال کرتے ہیں اور بعض ہمارے بزرگ سید کی اصل متعلق مدرسۃ العلوم کو سب سے زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ ہم ان سب تحریکوں کو پسند کرتے ہیں۔"[9]

۹- رفیق ہند، ۱۸ ستمبر ۱۸۵۵ء۔

اس مفصل خبر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہل پنجاب کے نزدیک جوبلی کی تقریبات کا انعقاد محض حکومتِ وقت کی خوشامد نہ تھی بلکہ اس کے پردے میں وہ قومی اور فکری فلاح اور بعض اہم تر نصب العین رکھتے تھے چنانچہ سب کمیٹی کی ابتدائی سفارشات کے مطابق دس ہزار روپے کا چندہ اکٹھا ہونا منظور ہوا جس میں سے پانچ ہزار روپے ایک دوامی یادگار پر خرچ کئے جائیں۔ یہ یادگار لاہور میں ایک ٹاؤن ہال کی شکل میں ہو جس کا سنگِ بنیاد خود لیفٹیننٹ گورنر رکھیں اور باقی پانچ ہزار روپے مختلف تقریبات پر خرچ کئے جائیں[10]۔

لاہور کی سب سے اہم سماجی تنظیم "انجمن اسلامیہ پنجاب" نے بھی اس جشن کے انعقاد کا پروگرام مرتب کیا۔ اس پروگرام کی تعمیل ایک کمیٹی کے سپرد ہوئی۔ جس کے صدر خان بہادر محمد برکت علیخاں اور سیکرٹری مولوی محرم علی چشتی تھے۔ انجمن کے اجلاس میں مندرجہ ذیل پانچ نکاتی پروگرام منظور ہوا۔

۱۔ ۱۶ رفروری کو ایک ایڈریس نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں جوبلی کی تقریب سے پیش کیا جائے۔

۲۔ تاریخ مذکور پر ایک ایک ٹیلی گرام مبارکباد جشن جوبلی کا حضور قیصرہ ہند و پرنس آف ویلز ڈیوک آف کناٹ بھیجا جائے۔

۳۔ تین وظائف جوبلی محمڈن سکالرشپ کے نام سے دس دس روپے ماہوار کے کالج کے طالب علموں کیلئے مقرر کئے جائیں اور ان وظائف کے دینے کا انتظام انجمن اسلامیہ کی ایجوکیشنل مینجنگ کمیٹی کے سپرد کیا جائے۔

۱۰۔ رفیق ھند، لاہور میں جشن جوبلی۔ ص۔ ۱۳۔

۴ - تاریخ مذکور پر شہر کی تمام مساجد میں مسلمانوں کے خرچ سے روشنی کرائی جائے -

۵ - تاریخ مذکور پر بادشاہی مسجد میں تمام مسلمان جمع ہو کر حضور قیصرہ ہند کی صحت وسلامتی اور لقائے حکومت کیلئے دعا مانگیں!! -

اسی طرح ۳ر فروری ۱۸۸۷ کو منٹگمری ہال میں عام باشندگان لاہور کا جلسہ ہوا جسمیں سر چارلس ایچسن نے تقریر کی -

۸ر فروری کو تین بجے ملتان میں جوبلی کا جلسہ منعقد ہوا - جسمیں سردار محمد حیات خاں بہادر سی - ایس - آئی ڈسٹرکٹ جج ملتان نے تقریر کی[۱۲] - رفیق ہند کے اس پرچے میں ۱۶ر فروری کے لاہور میں جشن جوبلی کی مفصل کاروائی درج ہے - ۲۶ر فروری کے رفیق ہند کے مطابق ہوشیار پور جشن جوبلی کی کاروائی میں مسٹر ٹمکنس ڈپٹی کمشنر کی وساطت سے ایک سپاسنامہ قیصرہ ہند کو روانہ کیا گیا - اس پرچے میں گکھڑ قوم کے اسی سلسلے میں پیش کئے گئے ایک سپاسنامے کا ذکر ہے -

اسی طرح رفیق ہند کے سال مذکور کے مختلف شماروں سے ہمیں پشاور، وزیر آباد، ہزارہ، گجرات، ممدوٹ، انبالہ اور جالندھر میں منعقد ہونے والے جوبلی تقریبات کی تفصیل ملتی ہے -

لاہور کے جشن جوبلی کا ذکر بعض اعتبارات سے خاص اہمیت رکھتا ہے - یہ جشن انجمن اسلامیہ پنجاب کی طرف سے ۱۶ر فروری ۱۸۸۷ء کو منایا گیا - اس روز شام کے پانچ بجے لیفٹیننٹ گورنر نے گول باغ میں دربار کیا - جس میں پنجاب کی ممتاز اور

---

۱۱ - رفیق ہند - ۵ر فروری ۱۸۸۷ - ص ۵ -

۱۲ - ایضاً ۱۹ر فروری ۱۸۸۷ - ص ۸ -

سربلند شخصیتوں کو خطابات اور انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ انجمن اسلامیہ پنجاب کے صدر نواب عبد المجید خاں کو سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا۔ انجمن قصور کے صدر منشی قادر بخش خاں کو خان بہادری کی سند ملی۔ نواب نوازش علی، خان بہادر برکت علی اور فقیر سید جمال الدین کو قیمتی خلعتیں اور سندیں ملیں۔

اسی دربار میں اردو کے مایہ ناز ادیب مولانا محمد حسین آزاد کو شمس العلماء کا خطاب سرکاری طور پر عطا ہوا جسے رفیق ہند کے ایڈیٹر نے ان کے شایان شان لکھا ہے۔[١٣]

اس تقریب پر انجمن اسلامیہ پنجاب کی طرف سے ایک ایڈریس ایک فارسی اور ایک اردو قصیدہ لیفٹیننٹ گورنر کو پیش کیا گیا۔ فارسی قصیدہ مولوی عبد اللہ فخری نے پیش کیا جس کا مطلع تھا۔

صبحدم ناگہ صدا از عالم بالا رسید

کایہاالناس افسر خوایں روز جشن ازما رسید

اور اردو قصیدہ مولانا الطاف حسین حالی نے پیش کیا جس کا مطلع تھا۔

ہے عید یہ کس جشن کی یا رب کہ سراسر

ہے جوبلی ہی جوبلی ایک اک کی زبان پر

انجمن اسلامیہ پنجاب کی اہمیت ملاحظہ فرمائیں کہ مولانا حالی بھی انجمن کی صف میں شامل ہو کر قصیدہ پیش کر رہے ہیں۔

انجمن قصور کی طرف سے اس تقریب میں خان بہادر منشی قادر بخش خاں نے ایڈریس پیش کیا۔

١٣۔ رفیق ہند۔ ١٩ر فروری ١٨٨٧ ص ١٣ کوکل

جشنِ جوبلی کے ادبی اور تعلیمی اثرات کے مفصل جائزے کا یہ موقع نہیں مختصراً یہ عرض کر دینا کافی ہے کہ ادبی لحاظ سے جشنِ جوبلی پر نثر اور نظم کی اچھی مقدار معرضِ وجود میں آئی اور ہندوستان کے باقی حصّوں کی طرح پنجاب کے ادیبوں اور شاعروں نے بھی جی کھول کر طبع آزمائی کی۔

تعلیمی اعتبار سے جشن جوبلی کا سب سے اہم ردِ عمل جوبلی وظائف کی شکل میں رونما ہوا۔ یہ وظائف مسلمانانِ پنجاب کے لئے مخصوص تھے۔ ان وظائف کے حصول کیلئے انجمن اسلامیہ پنجاب نے حکومت سے چارہ جوئی کی تھی لہذا رفیق ہند کے ایڈیٹر نے لکھا ہے کہ :

"ہم انجمن اسلامیہ لاہور اور مسلمانانِ پنجاب کو مبارکباد دیتے ہیں کہ ان کی کوششوں سے ایسی اعلیٰ درجے کی کامیابی ہوئی جو اس وقت پنجاب کی تواریخ میں بے نظیر ہے"[۱۸]

ان وظیفوں کی ابتدا خود انجمن اسلامیہ پنجاب لاہور اور انجمن اسلامیہ پنجاب امرتسر کے اپنے منظور کردہ وظائف سے ہوئی۔ مقدم الذکر نے مسلمان طالب علموں کیلئے تین وظیفے دس دس روپے کے اور موخر الذکر نے پندرہ روپے ماہوار کا ایک وظیفہ کالج کے مسلمان طالب علم کیلئے دینا منظور کیا تھا۔

سرکاری وظیفوں کا اعلان گورنمنٹ پنجاب کے صیغۂ تعلیم کے انڈر سیکرٹری کرنل ڈبلیو آر۔ ایم۔ ہالرائیڈ کی چھٹی نمبر ۲۸ مورخہ ۱۸ فروری ۱۸۸۷ء میں ہوا۔ اس اعلان کو ایک سرکلر کی صورت میں بعد ازاں "جمیع کمشنر و ڈپٹی کمشنر صاحبان،

۱۸۔ رفیق ہند۔ ۱۹ فروری ۱۸۸۷ء ص ۲۔

انسپکٹر و اسسٹنٹ انسپکٹر صاحبان مدارس و پرنسپل صاحبان سرکاری و امداد کالج ہائے پنجاب کے پاس ارسال کیا گیا۔ اس سرکلر کی رو سے چودہ جوبلی سکالرشپ پنجاب یونیورسٹی کے ایف۔اے، بی۔اے اور انٹرنس کے طالب علموں کو دیئے گئے۔ چالیس وظیفے مڈل کے سالانہ نتائج پر ہائی سکول میں تعلیم پانے والے مسلمان طالب علموں کو دیئے گئے۔ جن میں سے بارہ لاہور ڈویژن، چودہ راولپنڈی ڈویژن، آٹھ پشاور ڈویژن اور دس وظیفے ڈیرہ جات کیلئے مخصوص کئے گئے۔ اسی طرح میونسپل بورڈوں اور ڈسٹرکٹ اور میونسپل کمیٹیوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ پرائمری میں پاس ہونے والے ان ہونہار طالب علموں کو جو مڈل میں داخلہ لے چکے ہوں دو دو روپے ماہوار کے وظیفے عطا کریں۔ حکومت کے ان اقدام نے اہلِ پنجاب کے دلوں میں خوشی اور اُمید کی لہر دوڑا دی اور پنجاب میں ہر طرح تعلیم اور علم و ادب کے چرچے ہونے لگے۔

انیسویں صدی کے ربع آخر میں سیاسی صورتِ حال سے قطع نظر پنجاب میں چند اہم واقعات رونما ہوئے جنھوں نے اہلِ پنجاب کی علمی، ادبی اور فکری زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ ان واقعات میں سے تین کا تذکرہ خاص طور پر اہم ہے۔

۱۔ پنجاب یونیورسٹی کا قیام۔

۲۔ پنجاب میں سرسید کی دوسری بار آمد اور اس کے ادبی نتائج۔

۳۔ پنجاب کی صحت مند اور آزاد صحافت میں مسلمانوں کے ادبی و فکری ترجمان اخبار رفیق ہند کا اجراء۔

اب ان تینوں موضوعات کا ذرا سی تفصیل کیساتھ ترتیب وار مطالعہ کیا جاتا ہے۔

پنجاب یونیورسٹی کا قیام: جسطرح گزشتہ باب میں بیان کیا گیا ہے۔ انجمن پنجاب اور مخصوصاً اس کے صدر ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو لائٹنر کی کوششوں اور روسائے پنجاب کی سخاوت مندانہ ہمت سے ۱۸۶۹ء میں پنجاب یونیورسٹی کالج کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے تین اہم مقاصد ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

کی تحقیق کے مطابق یہ تھے ۔

۱۔ جہاں تک ممکن ہو پنجاب کی دیسی زبانوں (اردو ھندی) کے ذریعے یورپین علوم و فنون کو شائع کرنا اور اسی ادبیات کو ترقی دینا ۔

۲۔ مشرقی السنہ (عربی ۔ فارسی ۔ سنسکرت) اور ادبیات کی عمدہ تعلیم کو ہر طرح سے تقویت دینا ۔

۳۔ تعلیم عامہ کی نگرانی اور ترقی میں صوبہ ہذا کے اہل علم اور معزز اشخاص کو سرکاری افسروں کیساتھ شامل کرنا[۱۵]۔

مولوی عبدالرشید کے بیان کے مطابق اگست ۱۸۶۹ء میں صاحب سیکرٹری آف سٹیٹ نے یونیورسٹی کالج کا تقرر منظور فرمایا۔ ۔ ۔ ۔ دسمبر ۱۸۶۹ء میں کالج کے قواعد اور دستور العمل مشتہر ہوئے[۱۶]۔ جن دیسی سخاوت مندوں نے مشرقی علم و ادب کی اس جولاں گاہ کیلئے عطیے دیئے ان میں سب سے بڑی رقم یعنی ۶۲۲۰۰ روپے کا عطیہ مہاراجہ کشمیر کی طرف سے تھا ۔ جیسے ان کے اپنے بیان کے مطابق سنسکرت اور عربی کی تعلیم کیلئے دیا گیا تھا[۱۷]۔ ۱۸۶۸ء میں راجہ صاحب کپورتھلہ نے دو سو پونڈ سالانہ مقرر کیا جس کے بدلے میں دس ہزار روپیہ مرحمت کیا اور اپریل (۱۸۶۸) میں مہاراجہ صاحب پٹیالہ نے ۵ ہزار پونڈ دیئے اور راجہ صاحبان نابھہ اور جیند نے ہزار پونڈ دیئے اور سردار کلسیہ نے تین سو پونڈ دیئے ۔ سب مشرقی تعلیم کیلئے[۱۸]۔

---

۱۵ ۔ تاریخ اورینٹل کالج ص ۱۷ بحوالہ گورنمنٹ گزٹ ۲۳ دسمبر ۱۸۶۹ ۔

۱۶ ۔ مولوی عبدالرشید، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، مترجمہ میر نثار علی شہرت ۔ سن ندارد ۔

۱۷ ۔ ایضاً ص ۱۶ ۔

۱۸ ۔ ایضاً ص ۱۶، ۱۷ ۔

ڈاکٹر لائٹنر کی تشنگی علم نے محض کالج کے قیام پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ یونیورسٹی کے قیام کی کوشش برابر جاری رکھیں۔ ان کے ساتھ پنجاب کے رؤسا اور معارف پرور اصحاب علم بھی ہمنوا اور ہم قدم تھے۔ ان کے علاوہ پنجاب سے باہر ہندوستان کے مختلف حصوں میں اہل نظر اور اہل احساس مسلمان دانشمند بھی برابر ڈاکٹر لائٹنر کی مساعی کی تائید کر رہے تھے۔ ادھر سے مطالبہ ہوتا رہا اور ادھر یعنی حکومت کی طرف سے وعدے وعید ہوتے رہے۔ اس بات کا ثبوت سرسید کے اس احتجاج سے ملتا ہے جو انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کی حمایت میں گارساں دتاسی کے بقول ۱۸۷۰ء میں کیا۔ کیونکہ ۱۸۷۰ء کے مقالے میں دتاسی نے لکھا ہے:

> "سرسید احمد خاں نے اس بات پر احتجاج کیا ہے کہ حکومت نے اب تک لاہور میں اورینٹل یونیورسٹی قائم کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ اس کام کو آگے بڑھانے کی کوئی کوشش نہیں کی[19]۔"

۱۸۷۰ء میں یونیورسٹی کالج وجود میں آ چکا تھا۔ سرسید کی مراد کالج سے نہیں یونیورسٹی سے ہے۔ یونیورسٹی ہی کی حمایت میں گارساں دتاسی نے مطالبہ کیا کہ

> "مجھے پوری توقع ہے کہ لاہور کی "اورینٹل یونیورسٹی" کے قائم کرنے میں حکومت زیادہ لیت و لعل نہ کرے گی اور ۱۸۷۱ء میں اس کا کام شروع ہو جائے گا۔ اس یونیورسٹی کے متعلق اہل ہند برابر کئی سال سے مطالبہ کر رہے ہیں[20]۔"

یہ مطالبہ ۱۸۷۱ء کے گیارہ سال بعد ۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی کے قیام کی صورت میں پورا ہوا۔ اور پنجاب یونیورسٹی کیلنڈر ۱۸۸۴ء تا ۱۸۸۵ء کی رو سے ۱۴ اکتوبر ۱۸۸۲ء کو

---

۱۹ - مقالات گارساں دتاسی حصہ اول ص ۵۴

۲۰ - ایضاً - ص ۵۹ -

مجوزہ پنجاب یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ جیمز برڈ وڈ پہلے وائس چانسلر اور ڈاکٹر لائٹنر اس کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے۔ یونیورسٹی کا پہلا کانووکیشن جی آر السمی کے بیان کے مطابق ۱۸ نومبر ۱۸۸۲ء کو منعقد ہوا۔ جسمیں یونیورسٹی کے بانی، محسن اور مربی ڈاکٹر لائٹنر کو ڈی او ایل (D.O.L) کی ڈگری دی گئی۔ اس کنووکیشن کا افتتاح وائسرائے ہند لارڈ رپن نے کیا۔[21]

پنجاب یونیورسٹی میں مشرقی علوم و ادبیات کا شعبہ "اورینٹل کالج" یونیورسٹی کا جوہر اصلی اور اسم ذاتی تھا۔ اورینٹل کالج ہی ۱۸۸۲ء سے پہلے یونیورسٹی کالج تھا۔ لہٰذا یونیورسٹی کی تاسیس کے بعد ہرچند یہ اس کے ایک اہم شعبے کا نام قرار پایا تاہم اپنی معنوی حیثیت سے اسے یونیورسٹی کی روح یا بنیادی شعبہ کہنا چاہیے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے تاریخ اورینٹل کالج میں اس کے قیام یعنی ۱۸۶۹ء سے لیکر ۱۹۶۲ء تک کے تقریباً صد سالہ کام کا نہایت خوش اسلوبی سے جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے اپنے مطالعے کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ جسمیں پہلا دور ۱۸۷۰ء سے ۱۸۸۲ء تک اور دوسرا دور یعنی ۱۸۸۲ء سے ۱۹۱۰ء تک ہمارے موضوع سے تعلق رکھتا ہے۔ ۱۸۷۰ء سے ۱۸۸۲ء تک مشرقی علوم کی اس درسگاہ کے پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر تھے۔ جن کی تحقیقی بصیرت اور مشرقی ادبیات سے والہانہ وابستگی تاریخ ادب میں زندہ جاوید رہے گی۔ اورینٹل کالج کے پہلے دور میں جن موضوعات کی تدریس ہوتی تھی ان کی فہرست یہ ہے:

اردو، ہندی، گورمکھی، پشتو، علم انشا (اردو) فوجداری، سول، مالیات وغیرہ علم انشا (ہندی) حساب، طبیعات (اردو و ہندی) تاریخ و جغرافیہ، سنسکرت (گرائمر، ادبیات، ناٹک، خطابت فلسفہ ویدک وغیرہ) شعبہ قانون وراثت، طب یونانی، قانون اسلامی، قانون ہنود، علم طبقات الارض، کیمیا، منطق و فلسفہ، مشاعرہ و مناظرہ۔

21- G.R. ELSMIE, thirty five year in the Punjab, Lahore. 1975, P ۲۹۹ -

ان موضوعات میں سے بعض کا تعلق براہِ راست ادب سے ہے۔ اورینٹل کالج کے ہم عہد گورنمنٹ کالج بھی تھا۔ جس میں عربی، فارسی، اردو اور سنسکرت کی اعلیٰ تدریس کا انتظام موجود تھا۔

پنجاب یونیورسٹی کی اردو ادب میں خدمات اس کے جید اساتذہ اور ریسرچ سکالرز کے حوالے سے ہیں۔ شعبہ علوم مشرقی کے اساتذہ نے ادبی تحقیق اور تنقید کا جو معیار پیش کیا وہ نہ صرف ان کے دور کا نمونہ تھا۔ آج بھی قابلِ تقلید ہے۔ شعبہ مشرقی کے جن اساتذہ نے ہر دو ادوار میں اردو ادب کو مالا مال کیا ان میں سے ڈاکٹر لائٹنر، مولانا فیض الحسن سہارن پوری، مولانا عبدالحکیم کلانوری، مولوی محمد الدین، شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی، شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی محمد الدین مختار کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ریسرچ سکالروں میں سب سے اہم نام علامہ سر محمد اقبال کا ہے۔ جو ۱۳ مئی ۱۸۹۹ کو میکلوڈ پنجاب عربک ریڈر مقرر ہوئے اور چار برس تک اس حیثیت سے تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ واکرز کی سیاست مدن کا اردو ترجمہ اور اردو میں علم اقتصاد پر ایک تالیف انھوں نے اسی دوران میں مرتب کی[۲۲]۔ مولانا محمد حسین آزاد کی اردو تالیفات محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کی تفصیل آزاد پر درجنوں مقالات کے علاوہ محمد صادق اور اسلم فرخی کی قابلِ قدر تالیفات سے مل سکتی ہے۔

مذکورہ بالا اور دیگر اساتذہ کی تالیفات درج ذیل ہیں:

ڈاکٹر لائٹنر: سنینز اسلام (دو جلد) عربی صرف و نحو (انگریزی و اردو)

۲۲۔ تاریخ اورینٹل کالج ص ۴۴۔

مولانا فیض الحسن : شرح سبعہ معلقہ (عربی۔ فارسی۔ اردو) شرح حماسہ، رشیدیہ، فیضیہ (علم مناظرہ اردو)، دیوان حسان مرتب کیا، اورینٹل کالج کے مجلہ "شفا الصدور" کی ادارت بھی انجام دیتے رہے۔ ان کے علاوہ التعلیقات علی الجلالین، تحفہ صدیقیہ، عروض المفتاح۔ ریاض الفیض، دیوان الفیض، حل ابیات بیضاوی۔[۲۳]

مولانا محمد عبداللہ ٹونکی : التعلیقات علی شرح مسلم العلوم، عجالتہ الراکب فی امتناع کذب الواجب، فتاوی صابریہ (شرح محمدی اردو چہار جلد ۱۹۰۸، ۱۹۱۱ء، تحریر اقلیدس (عربی سے اردو ترجمہ) جلد اول ۱۹۰۲، الانوار الزاھیہ فی دیوان ابی لعتاھیہ۔[۲۴]

مولانا عبدالحکیم کلانوری۔ مبہمات القرآن، کنز الادب۔ قواعد فارسی، رسالہ ضائع بدائع۔ ہدایت الاملا۔ تاریخ معجم (فارسی تاریخ، مرتب ۱۸۸۴۔ ۱۸۸۵ء) انتخاب درہ نادر (تاریخ) انتخاب ناسخ التواریخ۔ جلاء القلوب (۱۸۹۸ء) تفسیر المبہمات (علم تفسیر) شرح قصیدہ لامیہ ۱۹۱۲۔[۲۵]

مولوی محمد الدین : روضتہ الادبا (عرب شعرا و ادبا و علما کے حالات) غایتہ الارب۔ فی تاریخ العرب (اردو) قلائد الذھب فی فواید الادب (عربی) حل لغات الف لیلہ (فارسی) مختصر السیر فی احوال خیر البشر المعروف بہ بستان محمدی، منتخبات اخلاق ناصری۔ تبیان الصنائع، فلسفہ ہملٹن، مخزن الفوائد (فارسی قواعد) میزان الاخلاق۔[۲۶]

۲۳۔ تاریخ اورینٹل کالج ص ۱۲۹، ۱۳۰

۲۴۔ ایضاً ص ۱۳۴، ۱۳۵

۲۵۔ ایضاً ص ۱۳۱، ۱۳۲

۲۶۔ ایضاً ص ۱۳۴

مولوی محمد الدین مختار: خلاصہ اخلاق ناصری، رسالہ منائح بدائع، خلاصہ مخزن الفوائد، شرح قصائد خاقانی، شرح تحفۃ الاحرار جامی، شرح اخلاق ناصری، خلاصہ اخلاق جلالی، شرح مخزن اسرار، رفیقی نامہ، روضۃ الابرار مختصر تاریخ کشمیر۔[۲۷]

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار یہ لکھتے ہوئے حق بجانب ہیں "کہ ان میں سے اکثر حضرات کے علمی و تحقیقی کارنامے اتنے وقیع اور وسیع ہیں کہ ان کے تذکرے کیلئے پوری ایک ایک کتاب چاہیے۔

۲ - پنجاب میں سرسید کی آمد:

سرسید احمد خاں نے فروری ۱۸۸۴ء میں پنجاب کا دوسری مرتبہ سفر کیا۔ سید صاحب پہلی مرتبہ ۱۸۷۴ء میں یہاں تشریف لائے تھے۔ معاصر اخباروں کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے اس سفر کی تفصیلات ہماری نظر سے اوجھل ہیں۔ اس سلسلے میں ہماری اطلاع کا دارومدار گارساں دتاسی کے درج ذیل بیان پر ہے جو ان کے ۱۸۷۴ء کے مقالے میں موجود ہے۔ چنانچہ لکھا ہے۔

"انجمن پنجاب نے (جس کا رکن ہونے کی عزت مجھے بھی حاصل ہے)۔ گذشتہ دسمبر میں سید احمد خاں کے اعزاز میں ایک شاندار جلسہ کیا۔ ساتھ ان کے بیٹے سید محمود بھی تھے . . . : سب سے پہلے محمد حیات خاں نے انجمن کی طرف سے سید صاحب اور ان کے فرزند کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے مسلمانوں کی بہبودی کی خاطر لاہور تک کا طولانی سفر اختیار کیا۔

---

۲۷ - تاریخ اورینٹل کالج - ص ۱۳۹

اس کے بعد ایڈریس پڑھا گیا۔ جس کا جواب سید صاحب نے اردو میں دیا لیکن سید محمود نے انگریزی میں ایسی دھواں دھار تقریر کی کہ سب انگشت بہ دنداں رہ گئے۔ اور تمام اخباروں میں اس کا چرچا ہوا۔"[۲۸]

دتاسی نے اس جگہ انجمن پنجاب کے سیکرٹری بابو نوین چندر رائے اور انجمن کے صدر محمد حیات خاں کی تقریروں کا خلاصہ بھی نقل کیا ہے۔

سر سید کے اس سفر کا مقصد بیان کرتے ہوئے دتاسی نے لکھا ہے کہ "شدید مخالفت کے باوجود سید صاحب کو ہمیشہ یہی دھن ہے کہ مسلمانوں کا کوئی مرکزی دارالعلوم قائم ہو جائے"[۲۹]۔ دتاسی کے غالباً مآخذ ہفتہ وار پنجابی لاہور کے شمارے ہیں۔ کیونکہ اس مقالے میں پنجاب سے متعلق اکثر مطالب اسی اخبار سے لئے گئے ہیں۔ پنجابی کا فائل دسترس میں نہ ہونے کے باعث انجمن پنجاب کے ایڈریس اور تقریروں کے تفصیلی مطالب تک رسائی ناممکن ہے۔ لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ سر سید کے سفر کا بنیادی مقصد علی گڑھ کالج کیلئے اہل پنجاب سے مالی امداد حاصل کرنا تھا۔ اس مقصد میں وہ کس حد تک کامیاب ہوئے، اس کی تفصیل بیان کرنا مشکل ہے۔ البتہ اس مقصد کیلئے جب انھوں نے پنجاب کا دوسرا سفر ۱۸۸۴ء میں اختیار کیا تو ایک تو خوش قسمتی سے ان کے فاضل رفقاء میں سے مولوی سید اقبال علی نے اس سفر کی مورد پسند تفصیلات "سر سید کا سفر نامہ پنجاب" کے عنوان سے کتابی صورت میں مرتب کر دیں اور دوسرے حسن اتفاق سے بعض معاصر اخبارات محفوظ

---

۲۸ - مقالات گارساں دتاسی حصہ دوم ص ۸۴

۲۹ - ایضاً۔

رہ گئے جن کی مدد سے اس سفر کے مقاصد اور غرض و غایت سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ معاصر اخباروں میں سب سے اہم اخبار ہفتہ وار رفیق ہند تھا۔ جس کا ۱۸۸۴ء کا فائل ہماری نظر سے گزرا ہے۔

سر سید کے زیرِ بحث سفر پنجاب کی تفصیلات جس طرح عرض کیا گیا۔ مولوی سید اقبال علی کے مرتبہ سفرنامے میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۷۳ء میں مجلس ترقی ادب لاہور سے دوسری بار شائع ہو چکی ہے۔ پہلا ایڈیشن علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس سے ۱۳۰۱ ھجری میں شائع ہوا تھا۔ یہاں اس سفر کے بعض اہم واقعات و نتائج کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔

رفیق ہند کے ۱۲ر جنوری ۱۸۸۴ء کے شمارے کی ایک خبر سے معلوم ہوتا ہے کہ سر سید قیام لاہور کے دوران میں "اسلامیہ ہوٹل" نزد ریلوے سٹیشن پر قیام فرمائیں گے۔ آپ ۲۲ر جنوری ۱۸۸۴ء کو علی گڑھ سے اپنے دوستوں حاجی محمد اسمٰعیل رئیس دتاولی ضلع علی گڑھ، مولوی سید اقبال علی منصف گونڈہ اور اپنے نواسے سید محمد علی اور چند خدمت گاروں کے ساتھ پنجاب کی طرف عزیمت فرمائیں گے۔ چنانچہ سفرنامہ سر سید کی رو سے سید صاحب پروگرام کے عین مطابق ۲۲ر جنوری کو عازم پنجاب ہوئے اور لدھیانہ، جالندھر، امرتسر، گورداسپور پھر امرتسر، لاہور پھر جالندھر، پٹیالہ اور آخر میں مظفر نگر سے ہوتے ہوئے واپس علی گڑھ تشریف لے گئے۔ سر سید کا یہ طویل سفر ۲۲ر جنوری کو شروع ہوا اور غالباً ۱۰ر فروری کو انجام تک پہنچا۔ دیکھنے کو یہ محض اُنیس دن کی مدت ہے لیکن پنجاب کی قومی اور ادبی زندگی میں اس کے اثرات تقریباً پون صدی تک منعکس رہے۔

سر سید کے سفر پنجاب کا بنیادی مقصد جیسا کہ اس سفر کے مفسرین نے بیان

کیا ہے ۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کیلئے مالی امداد کی فراہمی تھا ۔ لیکن اس بنیادی مقصد کے ساتھ ساتھ کچھ اور مقاصد بھی سرسید کے پیش نظر تھے جنہیں ذیلی مقصد کا نام دیا جا سکتا ہے ۔ ان ذیلی مقاصد کا تعلق اہل ہند کی بالعموم اور مسلمانانِ ہند کی بالخصوص قومی، سیاسی، تعلیمی، ادبی اور اجتماعی زندگی کے مسائل تھے ۔ چنانچہ سرسید کے سفر پنجاب کی معنوی غرض و غایت شاید اپنی ذیلی مقاصد سے تشکیل پاتی ہے ۔ ان ذیلی مقاصد کی مختصر فہرست یوں مرتب کی جا سکتی ہے ۔

۱ ۔ تعلیم کی غایت، مفہوم، اہمیت، مقصد اور راہ حصول ۔

۲ ۔ ہندوستانی قومیت کا تصور اور ہندو مسلم اتحاد ۔

۳ ۔ گورنمنٹ کی فرمانبرداری اور تہذیب کا نیا مفہوم ۔

۴ ۔ اسلام کا عقلی اور منطقی تصور ۔

سرسید کے تعلیمی مقاصد کو سمجھنے کیلئے مقالات سرسید[۳۰] کی آٹھویں جلد کا مطالعہ ضروری ہے ۔ جو تعلیمی موضوعات پر مشتمل ہے ۔ سفر پنجاب کے حوالے سے سرسید کے تعلیمی فلسفے کے جو نکات سامنے آتے ہیں ان کے مطابق سرسید کا مقصد مسلمانانِ ہند کے درمیان قومی تعلیم کو فروغ دینا تھا ۔ قومی تعلیم ان کے نزدیک ایک خاص مفہوم رکھتی تھی ۔ قومی تعلیم سے ان کی مراد ایسی تعلیم تھی جو اس عہد کے سیاسی، قومی، فکری اور اخلاقی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ملتِ اسلامیہ کو باوقار بنا سکے ۔ یہ عہد ۱۸۵۷ء کی صورتِ حال کے بعد مسلمانوں

---

۳۰ ۔ شیخ اسماعیل پانی پتی، مقالات سرسید، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ ۔

کی عام زندگی میں رونما ہوا تھا۔

قومی تعلیم پر بحث سرسید کے مختلف لیکچروں میں ہے۔ ۲۳ر جنوری ۱۸۸۴ء کو لدھیانہ میں تعلیم پر لیکچر دیتے ہوئے اُنھوں نے فرمایا:

"اے بھائیو! تعلیم کا اور مخصوصاً قومی تعلیم کا معاملہ جیسا نازک ہے ویسا ہی مشکل بھی ہے۔ ہماری قوم نے نہ کبھی اسپر غور کیا ہے اور نہ ان ملکوں کو جہاں قومی تعلیم کو ترقی ہے۔ دیکھا ہے۔ اور اگر دیکھا ہے تو اس کی ترقی کے اسباب پر بہت کم غور کی ہے۔ میرے بال اس فکر میں سفید ہوگئے ہیں۔ قومی تعلیم پر غور کرتے کرتے پچیس برس سے زیادہ کا زمانہ گزر گیا ہے۔ یہ زمانہ اب نہیں رہا کہ ہم لوگوں کو مسجدوں اور خانقاہوں میں بٹھاکر اور انکو خیرات کی روٹی دیکر یا چھوٹے موٹے سکول و مکتب قائم کرکے قومی تعلیم کو ترقی دے لیں گے۔ یہ کام اس وقت مفید ہوتے ہیں جب کہ قوم نے اعلیٰ سے اعلیٰ سامان قومی تعلیم کا مہیا کرلیا ہو۔ مگر ہم نے اس اعلیٰ تعلیم کا جو درحقیقت قومی ترقی اور قومی افتخار کا باعث ہے۔ کچھ سامان نہیں کیا . . . . انہی تمام خیالات کا باعث ہے جو میں نے علی گڑھ میں ایک قومی مدرسہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے[۳۱]"۔

سرسید کے قومی یا تعلیمی نظریات کا مفصل جائزہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ لیکن صرف اسی قدر عرض کر دینا موضوع کو سمجھنے کیلئے کافی ہے کہ قوم سے مراد سرسید کی مسلم قومیت یا اہل اسلام نہیں ہے۔ قومیت کا یہ تصور یقیناً قومی تعلیم کے نظریے کو سمجھنے

---

۳۱ - سرسید احمد خاں کا سفرنامہ پنجاب ص ۲۲، ۲۳۔

میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ لہٰذا سرسید کی زبانی قوم کی تعریف میں ملاحظہ فرمائیے ۔۔۔
مدرسۂ گورداسپور میں لیکچر دیتے ہوئے سرسید فرماتے ہیں:

"پُرانی تاریخوں میں، پرانی کتابوں میں دیکھا اور سُنا ہوگا اور اب بھی دیکھتے ہیں کہ قوم کا اطلاق ایک مُلک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے ۔۔۔ افغانستان کے مختلف لوگ ایک قوم کہے جاتے ہیں۔ ایران کے مختلف لوگ ایرانی کہلاتے ہیں۔ یورپین مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں۔ گو ان میں دوسرے ملک کے لوگ آکر بس جاتے ہیں۔ مگر وہ آپسمیں مِل جُل کر ایک ہی قوم کہلائے جاتے ہیں۔ غرض کہ قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے۔ تو ان میں بعض بعض خصوصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ اے ہندو اور مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو؟ کیا اس زمین پر تم دونوں نہیں بستے؟ کیا اس زمین میں تم دفن نہیں ہوتے ہو یا اس زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے؟ اسپر مرتے ہو اور اسپر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ "ہندو اور مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے" ورنہ ہندو، مسلمان اور عیسائی بھی، جو اس ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے سب ایک ہی قوم ہیں"[۳۲]۔

تعلیم کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے اُنھوں نے فرمایا۔ قومی تعلیم سے مُراد نیشنل ایجوکیشن ہے۔ چنانچہ ٹاؤن ہال امرتسر میں لیکچر کے دوران میں اعلان کیا۔

---

۳۲ - سرسید کا سفرنامہ پنجاب ص ۱۳۲ -

"آدمی بنانے کے واسطے جب تک ہماری قوم میں ہائی ایجوکیشن نہ پھیلے گی ہماری قوم آدمی نہیں بن سکتی۔[۳۳]"

اور تعلیم کا نصب العین بیان کرتے ہوئے جالندھر کے والپسی خطبے میں فرمایا:

"جو مناسبت مجھے مشرقی علوم سے بوجہ ہندوستان کے باشندے ہونے یا باپ دادا کے موروثی علوم ہونے کے سبب سے ہے۔ میرے دل میں اس بات کو آنا چاہیئے تھا کہ یہی علوم قابلِ ادب ہیں اور انہی علوم کو از سرِ نو زندہ کرنا یا ترقی دینا چاہیئے۔ مگر زمانے کی چال نے مجھکو یہ سکھایا ہے کہ ہمارے نوجوان طالب علم اور پیارے بچے انگلش لٹریچر اور یورپین سائنس سیکھیں۔[۳۴]"

اس خطبے میں سرسید نے واضح طور پر مشرقی علوم کو باپ دادا کے فرسودہ، فی زمانہ غیر مفید اور غیر ضروری علوم قرار دیکر بار بار انگلش لٹریچر اور سائنس کی تعلیم پر زور دیا ہے۔ اور اسی حوالے سے مدرستہ العلوم علی گڑھ کے قیام اور اس کی ضرورت پر لوگوں کو متوجہ کیا ہے۔

سرسید کے لیکچر پنجاب کے مختلف شہروں میں محبوبیت حاصل کرتے رہے۔ اور بقول سرسید "ابیض نورانی"[۳۵] کی بارش بھی ہوتی رہی۔ اور بعض اسلامی قومیت کے حامی بزرگوں کی ہلکی ہلکی مخالفت کے باوجود سرسید کے نظریات بڑی فاتحانہ شان و شوکت

۳۳۔ سرسید کا سفرنامہ پنجاب ص ۱۶۰

۳۴۔ ایضاً ص ۳۴۷۔

۳۵۔ مولوی اقبال علی کے بقول چاندی کے چمکتے ہوئے سکوں کو جو چندے میں ملتے تھے سید صاحب انہیں "ابیض نورانی" کہتے تھے (سفرنامہ پنجاب) ص ۱۰۱۔

سے پنجاب کے پایہ تخت لاہور کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ درمیان میں دو سخن گسترانہ مسائل آ گئے۔ جن کو شاید سرسید اور ان کے رفقا نے پہلے پیش بینی نہیں کیا تھا۔ اور یوں کہیئے کہ وہ ان کے لئے بطور کلی خلاف توقع تھے۔ ان میں سے ایک "تعلیم نسواں" کا موضوع اور دوسرا اسلام کی نیچرل توضیح و تفسیر، ان دونوں مسائل پر سرسید کے نظریات بالکل واضح تھے البتہ وہ ماحول اور اہل پنجاب کے تقاضوں اور احساسات کے مطابق ان کی تفسیر میں کوئی رد و بدل نہیں کر سکے۔

۲۵ر جنوری ۱۸۸۴ء کو سرسید نے گورداسپور میں خاتون پنجاب کی طرف سے دیئے گئے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے تعلیم نسواں کے بارے میں اپنے نظریات کا یوں اعلان کیا۔

"اے میری بہنو! میں اپنی قوم کی خاتونوں کی تعلیم سے بے پروا نہیں ہوں۔ میں دل سے ان کی ترقی تعلیم کا خواہاں ہوں۔ مجھ کو جہاں تک مخالفت ہے۔ اس طریقہ تعلیم سے ہے۔ جس کے اختیار کرنے پر اس زمانے کے کوتاہ اندیش حامی ہیں۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنا پرانا طریقہ تعلیم اختیار کرنے پر کوشش کرو۔ وہی طریقہ تمہارے لئے دین و دنیا میں بھلائی کا پھل دیگا، اور کانوں میں پڑنے سے محفوظ رکھے گا۔"[۳۶]

"میری یہ خواہش نہیں ہے کہ تم ان مقدس کتابوں کے بدلے جو تمہاری

۳۶۔ سرسید احمد خاں کا سفر نامہ پنجاب ص ۱۴۲۔

دادیاں اور نانیاں پڑھتی آئی ہیں، اس زمانے کی مروجہ نامبارک کتابوں
کو پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانے میں پھیلتی جاتی ہیں[۳۷]۔"

اسلام کی نیچرل تفسیر کے بارے میں وضاحت اس لیکچر میں ہے جو سرسید نے یکم فروری ۱۸۸۴ء کو لاہور میں دیا۔ یہ لیکچر مہاراجہ کپور تھلہ کی کوٹھی میں جہاں سید صاحب ٹھہرے ہوئے تھے دیا گیا۔ شرط یہ تھی خاص خاص سامعین ہوں۔ جنہیں مطلع کرنے کی ذمہ داری شمس العلماء سید ممتاز علی کو سونپی گئی۔ یہ معاصر اخباروں میں غالباً صرف رفیق ہند میں شائع ہوا۔ سرسید نے اس خطبے میں بعض ایسے نکات بیان کیے۔ انھوں نے پنجاب کے علمائے دین کو چونکا دیا۔ اسلیے کہ انھوں نے دینی نقطہ نظر سے ان مسائل کو پہلی مرتبہ سنا تھا اس لیکچر سے دو اقتباس پیش کیے جاتے ہیں۔

"جو شخص خدا کو مانتا ہے اور وحدہٗ لاشریک جانتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے۔ اور کسی نبی کی تصدیق نہیں کرتا اور آنحضرت صلعم کی تصدیق بھی نہیں کرتا اس کی نسبت کہنا کہ وہ مسلمان نہیں ہے بالکل صحیح ہے مگر اسکو کافر بمعنی مشرک کہنا یا موحد نہ کہنا اسلام کی رو سے درست نہیں[۳۸]۔"

"وحدانیت اور رسالت کی تصدیق کے بعد اور چیزیں بھی اسلام کے ساتھ ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ

---

۳۷ - سرسید احمد خاں کا سفر نامہ پنجاب، ص ۱۹۱

دادیاں اور نانیاں پڑھتی آئی ہیں، اس زمانے کی مروجہ نامبارک کتابوں
کو پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانے میں پھیلتی جاتی ہیں[۳۷]۔

اسلام کی نیچرل تفسیر کے بارے میں وضاحت اس لیکچر میں ہے جو سر سید نے یکم فروری ۱۸۸۴ء کو لاہور میں دیا۔ یہ لیکچر مہاراجہ کپور تھلہ کی کوٹھی میں جہاں سید صاحب ٹھہرے ہوئے تھے دیا گیا۔ شرط یہ تھی خاص خاص سامعین ہوں۔ جنہیں مطلع کرنے کی ذمہ داری شمس العلماء سید ممتاز علی کو سونپی گئی۔ یہ معاصر اخباروں میں غالباً صرف رفیق ھند میں شائع ہوا۔ سر سید نے اس خطبے میں بعض ایسے نکات بیان کئے۔ انھوں نے پنجاب کے علمائے دین کو چونکا دیا۔ اسلئے کہ انھوں نے دینی نقطہ نظر سے ان مسائل کو پہلی مرتبہ سنا تھا اس لیکچر سے دو اقتباس پیش کئے جاتے ہیں۔

"جو شخص خدا کو مانتا ہے اور وحدۃ لاشریک جانتا ہے اور اسپر یقین رکھتا ہے۔ اور کسی نبی کی تصدیق نہیں کرتا اور آنحضرت صلعم کی تصدیق بھی نہیں کرتا اس کی نسبت کہنا کہ وہ مسلمان نہیں ہے بالکل صحیح ہے مگر اسکو کافر بمعنی مشرک کہنا یا موحد نہ کہنا اسلام کی رو سے درست نہیں[۳۸]۔"

"وحدانیت اور رسالت کی تصدیق کے بعد اور چیزیں بھی اسلام کے ساتھ ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے مثلاً نماز، روزہ، حج، زکواۃ وغیرہ

---

۳۷ - سر سید احمد خاں کا سفر نامہ پنجاب۔ ص ۱۴۴

۳۸ - ایضاً ص ۲۸۰

ان فرائض کے ادا نہ کرنے والے کو ہم گنہگار اور ان کے منکر کی نسبت
وہی کہیں گے جو رسالت کے منکر کی نسبت کہا ہے ۔ کہ وہ محمدی نہیں یا
بمعنی مرادف مسلمان نہیں ۔ اس کے ملحد فی النار ہونے یا نہ ہونے
کی نسبت وہی بحث آ جاتی ہے جو ابھی موحد محض کی نسبت میں نے بیان کی"[۳۹]۔

یہاں ہم مذہبی بحث میں نہیں پڑیں گے ۔ ان دونوں مسائل کا تذکرہ اسلئے
مثالوں کے ساتھ کیا گیا ہے کہ سرسید کے سفر پنجاب میں یہ مسائل اختلاف اور
نزاع کا باعث بنے ۔ حتیٰ کہ سرسید اور ان کے رفقاء کو بعض جگہ بدمزگی کا سامنا
بھی ہوا ۔

مولوی اقبال علی نے سفرنامہ سرسید میں یک طرفہ رویہ اختیار کیا ہے
صرف سرسید کے مداح اور طرفدار اخباروں کی کارروائیاں درج کی ہیں ۔ اور
سوائے ایک اخبار یعنی شفاء الصدور کے جس کی اہمیت سرسید کے استاد مولانا
فیض الحسن سہارنپوری کی وجہ سے تھی ۔ مخالف اخباروں کے مطالب کا تذکرہ
نہیں کیا ۔ ہفتہ وار آفتاب پنجاب کی مخالفت کا ذکر مولانا فیض الحسن سہارنپوری
نے سرسید کے خلاف اپنے عربی مقالے میں کیا ہے ، جو شفا الصدور کے ۱۰ ار
فروری ۱۸۸۴ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا ۔ معاصر اخباروں کے نایاب ہونے کی
وجہ سے ان مسائل پر بحث کرنا ممکن نہیں لیکن رفیق ھند کا ۱۸۸۴ء کا فائل
محفوظ ہونے کے سبب سے تھوڑا سا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ واضح رہے کہ رفیق
ھند بھی سرسید کے مخالف اخباروں میں سے نہیں ہے ۔ اس کا ایڈیٹر آزاد خیال ہے

---

۳۹ - سرسید احمد خاں کا سفرنامہ پنجاب ص ۲۱۸

جس کا اعتراف مولوی اقبال علی نے جگہ جگہ کیا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ سرسید کی مذہبی پالیسی پر اپنا اور معاصرین کا ردِ عمل بیان کرتا ہے لیکن قومی اصلاح کے کاموں میں عقیدت کی انتہا تک سرسید کا مداح اور حامی ہے۔

سرسید کے تعلیم نسواں کے نظریے کی مخالفت میں سب سے پہلا مضمون ۱۶ر فروری ۱۸۸۴ء کے رفیق ہند میں شائع ہوا۔ اس کی لکھنے والی ایک خاتون ہے جس نے اپنا نام نہیں دیا اور مضمون کے آخر میں محض "حضرت کی ایک خادمہ" لکھا ہے اس مضمون کا عنوان ہے۔

"سیّد احمد شاہ خاں صاحب اور تعلیمِ نسواں"

اس مقالے کا انداز مزاحیہ سا ہے۔ اور اس میں اس بات کا شکریہ ادا کیا گیا ہے کہ سید صاحب نے مسلمان بہنوں کو اور کسی لائق نہیں سمجھا اور شب و روز کلمہ کلام پڑھنے کی ماموریت ہی سونپ دی ہے۔

دوسرا مقالہ خان بہادر قادر بخش خاں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لدھیانہ کا ہے جو رفیق ہند کے ۱۱ر اکتوبر ۱۸۸۴ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ عنوان ہے۔ "تعلیم نسواں" - ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"اس قوت (لیاقت انسانی، خوش خلقی، اتفاق) کے حاصل کرنے کی ضرورت جیسے کہ ہم لوگ مردوں کے واسطے خیال کرتے ہیں۔ ویسے ہی عورات کیلئے ضروری ہے کیونکہ بیشتر امورات دنیاوی کا اہتمام اور انصرام اسی فرقہ عورات کے متعلق ہے۔ اور یہی فرقہ بموجب رسم و رواج ہمارے ملک کے اس دولت لازوال (علم دینوی) سے محروم ہے اور اس کی محرومیت سے جو جو نقصانات ہمارے ہموطنوں کو پہنچے

ہیں اور جو جو صدمے ہمارے ہمعصر اُٹھاتے ہیں وہ ہمارے ہی دل جانتے ہیں[۴۰]"

سرسید کے سفر پنجاب نے اردو ادب کو بعض تازہ موضوعات دیئے۔ مختلف مجالس میں دینی اور تعلیمی مسائل سے لیکر ادبی اور لسانی مسائل تک تقریباً ربع صدی کا زمانہ بحثوں سے پُر ہے۔ ۱۸۸۴ء سے ۱۸۸۸ء تک سرسید کے بارے میں جو مقالات منظر عام پر آئے۔ ہفتہ وار رفیق ہند کے حوالے سے ان کی ایک سرسری فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ مسلمانوں کی بدحالی کا مرثیہ : محمد تہور علی — ۲۷ ستمبر ۱۸۸۴ء
۲۔ تعلیم نسواں : قادر بخش خاں بہادر — ۱۱ اکتوبر ۱۸۸۴ء
۳۔ تعلیم نسواں : راقمہ نام ندارد — ۷ فروری ۱۸۸۵ء
۴۔ مُسلمان مستورات کی تعلیم کا انتظام : محرم علی چشتی — ۱۶ مئی ۱۸۸۵ء
۵۔ مسلمانوں کی تعلیم پر گورنمنٹ ہند کا ریزولیشن : محرم علی چشتی — یکم اگست ۱۸۸۵ء
۶۔ مسلمانوں کی عام تعلیم : محرم علی چشتی — ۶ مارچ ۱۸۸۶ء
۷۔ کتاب اسلام و مسلمان : سید محمد حسین اغلب — ۱۲ جون ۱۸۸۶ء
۸۔ لاہوری عورتوں کی حالت : پنجابی شیکسپیر — ۱۶ اگست ۱۸۸۷ء
۹۔ اسلام اور اسلامی مدارس : ڈاکٹر لائٹنر — ۱۷ مارچ ۱۸۸۸ء
۱۰۔ قومی نوحہ : وحید الدین سلیم — ۱۸ اگست ۱۸۸۸ء
۱۱۔ ہم اور سرسید : محرم علی چشتی — ۲۲ دسمبر ۱۸۸۸ء
۱۲۔ سرسید اور پنجاب : اکبر علی — ۲۹ دسمبر ۱۸۸۸ء

۴۰۔ رفیق ہند ۱۶ فروری ۱۸۸۴ء

سرسید کے مذہبی نظریات کی مخالفت انیسویں صدی کے آخر تک پنجاب میں زوروں پر رہی۔ اس مخالفت میں تقریباً تمام ہندوستان کے مسلمان علماء اور دانشمند اہلِ پنجاب کے ہم زبان اور ہم آواز تھے۔ حتیٰ کہ سرسید کے بعض نزدیکی رفقاء بھی اس اعلائے کلمۂ حق میں سرسید سے جُدا ہوگئے تھے۔ نواب محسن الملک کی تحریریں اس موضوع پر خاص شہرت رکھتی ہیں۔

پنجاب میں مذہبی ادب کا رُخ پہلے عیسائیت کے خلاف تھا، پھر سرسید کی طرف ہُوا، اور آخر میں مرزا غلام احمد قادیانی کے اعلان نبوت کیساتھ علماء اور لکھنے والوں کی تمام توجہ قادیانی تحریک کے خلاف ہوگئی۔ پنجاب کے مذہبی ادب میں اگر انیسویں صدی مذہبی اور فکری اختلافات کا زمانہ ہے تو دُوسری طرف اردو نثر کا دامن اظہار و بیان کے مختلف اسلوبوں سے مالا مال نظر آتا ہے۔ اس دور کی تمام دینی نثر خطیبانہ نہیں بلکہ ان میں سے بعض تحریریں فی الواقع ایسی ہیں کہ انھیں اردو کے نثری اسلوب میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے۔

سرسید کے مذہبی عقاید کی دوبارہ مخالفت انیسویں صدی کے آخر میں ڈپٹی نذیر احمد کے حوالے سے شروع ہوئی۔ ڈپٹی نذیر احمد ۱۸۹۳ء میں لاہور آئے اور انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں اسلام پر نیچرل سائنس کے نقطۂ نظر سے لیکچر دے دیا۔ یہ لیکچر مسلمانوں کے سوئے ہوئے جذبات میں دوبارہ اشتعال پیدا کرنے کے مترادف تھا۔ لاہور کی اردو صحافت نے بالخصوص اور ہندوستان کے اکثر اخباروں نے بالعموم اس خطبے کی مخالفت کی اور اسی طرح اردو نثر میں سرسید اور ان کے رفقاء کے خلاف اچھا خاصا مواد جمع ہوگیا۔

۳ - صحت مند صحافت اور رفیق ہند کا اجراء :

انیسویں صدی کا نصف دوم ہندوستان بھر میں صحت مند اور نسبتاً آزاد صحافت کا دور ہے ۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب پنجاب اردو ادب کا مرکز بنا تو اردو صحافت بھی پنجاب میں پھلنے پھولنے لگی ۔ ۱۸۵۷ء کے اردگرد یا پہلے پنجاب سے دو اخبار شائع ہوتے تھے ۔ ان میں ملکی سیاست پر انتقاد بہت دبے ہوئے لہجے میں ملتا ہے ۔ یہ سیالکوٹ کے منشی دیوان چند ہوں یا لاہور کے منشی ہرسکھ رائے ، ملتان کے منشی مہدی حسین افسر ہوں یا لاہور کے محمد حسن کلانوری ، ایک خاص لہجے سے اپنے احساسات اور رائے عامہ کا اظہار کرتے تھے ۔ اس میں شک نہیں کہ چارلس مٹکاف کی ۱۸۳۵ء کی رپورٹ کے بعد ہندوستان پر آزادی صحافت کا دروازہ کھل چکا تھا پھر بھی بقول ڈاکٹر عبدالسلام خورشید :

> "۱۸۳۵ کے بعد اصولاً اور قانوناً صحافت آزاد تھی ۔ لیکن عملاً پابند تھی ۔ زیادہ تر اخبار حکومت کی طرف سے دی ہوئی بالواسطہ یا بلا واسطہ امداد پر دارو مدار رکھتے تھے اور جنہیں امداد حاصل نہیں تھی انہیں امداد کی امید پابند بنائے رکھتی تھی ۔ پھر اجنبی راج کی عمومی دہشت بھی ایسی تھی کہ کسی کو بے باک نکتہ چینی کی جرأت نہیں ہوتی تھی ۔" [۱]

انیسویں صدی کے ربع آخر میں پنجاب کی فضائے صحافت پر جو اردو اخبار چھائے ہوئے تھے ان میں اخبار انجمن پنجاب ، کوہ نور ، سفیر ہند ، خضر ہند ، دہلی پنچ ،

---

۱ - صحافت پاکستان و ہند میں ۔ ص ۱۵۴ ۔

آئینہ ہند، خالصہ پنجاب، خیرخواہ کشمیر، آئینہ اخلاق، شفیق ہند، وزیر ہند، سفیر پنجاب، مہذب اور پیسہ اخبار کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے اخبار انجمن پنجاب اور کوہِ نور کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ انجمن پنجاب خود نیم سرکاری تنظیم تھی۔ اس کا اخبار ملکی سیاست سے زیادہ اصلاح معاشرہ، اصلاح ادب اور ملکی مشاورت کے فرائض انجام دیتا تھا۔ کوہِ نور ۱۸۷۴ء تک پورے طور پر حکومت کے اثر میں آچکا تھا۔ تاہم اس کے ایڈیٹر کی دیرینہ آرزو تھی کہ وہ بھی دوسرے ہم عصروں کی طرح آزادی اظہار کا مالک ہو اور ایک آزاد اور باضمیر صحافی کی حیثیت سے ان اختیارات کا صحیح طور پر استعمال کر سکے۔ جو ۱۸۳۵ء کے پریس ایکٹ نے اسے دیے ہیں۔ واضح رہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کوہِ نور کی پالیسی بالکل آزاد تھی۔ اور وہ عوامی آواز ہونے کی حیثیت سے حکومت پر بھی بے لاگ تنقید کرتا تھا۔ ۱۸۷۴ء کے قریب کوہِ نور کا ایڈیٹر اپنی موجودہ صورتِ حال سے اکتا چکا تھا۔ اور یہاں تک مایوس ہو چکا تھا کہ اپنی کھوئی ہوئی آزادی کو حاصل کرنے کیلئے موجودہ اخبار کو بند کر کے ایک تازہ اخبار نکالنے کا آرزو مند تھا۔ چنانچہ گارساں دتاسی ۱۸۷۴ء کے مقالے میں لکھتے ہیں:

"کوہِ نور (لاہور) کے ایڈیٹر نے ارادہ کیا ہے کہ اس اخبار کو چھوڑ کر کوئی اور جریدہ نکالیں جو حکومت کے اثر سے آزاد ہو، تاکہ وہ بلا تکلف حکومت پر بھی تبصرہ کر سکیں[۴۲]۔"

اس بیان سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ۱۸۷۴ء کے قریب اردو

۴۲۔ مقالات گارساں دتاسی (حصۂ دوم) ص ۷۳۔

صحافت اظہار و بیان کی آزادی کے بہت سے مراحل طے کر چکی تھی۔

اسی فضا میں ۵ جنوری ۱۸۸۴ء کو ہفتہ وار رفیق ہند کا اجراء مولوی محرم علی چشتی کی ادارت میں ہوا۔ پہلے شمارے میں افتتاحی مقالہ ملک کے ممتاز دانشمند سر سید احمد خاں نے تحریر فرمایا۔ اس مقالے میں رفیق ہند کے اجراء کی اہمیت کے بعد ایڈیٹر کی اہلیت اور قابلیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:

"ہمارے ملک کے اخباروں میں پنجاب کے اخبار بلاشبہ سب سے عمدہ ہیں۔ میں انکو منزہ نہیں کہتا، مگر اعلیٰ اور عمدہ کہتا ہوں۔ نہایت خوشی کی بات ہے کہ ان عمدہ اخباروں میں ایک اور اخبار "رفیق ہند" کا اضافہ ہوتا ہے۔ جسکی نسبت توقع ہے کہ نیو ایرز ڈے کو نیا اخبار پیدا ہونے والا ہے۔ ہمارے شفیق مولوی محرم علی چشتی جن کی ذہانت جودت طبع، تیزی خیالات اور ہمدرد قوم مشہور و معروف ہے اس اخبار کو نکالتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ وہ اخبار تمام صفتوں کیساتھ سلیم الطبع اور متحمل مزاج ہی ہو گا۔ اور جس قدر ممکن ہے ملک کو فائدہ پہنچا دیگا۔ اے خدا! تو ایسا ہی کر!! آمین!!!—

راقم سید احمد۔ مقام علی گڑھ[۴۳]"۔

مولوی محرم علی چشتی نے اس قیمتی مقالے کو ایڈیٹوریل میں جگہ دیتے اور سید صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا:

"ہمارے آنریبل قبلہ عالی جناب مولوی سید احمد خاں صاحب بہادر

---

۴۳ - رفیق ہند (ہفتہ وار) لاہور ۵ جنوری ۱۸۸۴ء بروز شنبہ۔

سی۔ ایس۔ آئی نے رفیق ھند کے جاری ہونے کا حال معلوم کرکے براہ مرحمت بزرگانہ ہمیں مندرجہ ذیل مضمون عطا فرمایا ہے۔ جس کے اندراج سے ہم سب سے پہلے اپنے ایڈیٹوریل کالموں کو مفتخر کرتے ہیں۴۴"۔

رفیق ھند کی مفصل پالیسی کا اعلان یُوں کیا گیا تھا:

"ہمارے ملک کے اہل الرائے کا عموماً اس بات پر کلی اتفاق ہے کہ دیسی زبان کے اخبارات میں ابھی تک ایک ایسے قومی اخبار کی ضرورت باقی ہے جو انگریزی اخبارات کے پورے نمونے پر آزادی سے اپنے قومی اتحاد کے وسائل پیدا کرکے ہندوستان کے مُختلف فرقوں کو ایک پولیٹیکل پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کرے۔ اور راستبازی سے ان خلاف قانون زیادتیوں کو گورنمنٹ اور مُلک کی خدمت میں پیش کرتا رہے۔ جو بعض سرکاری عہدہ داروں کے ہاتھ سے ہندوستانی رعایا پر خصوصاً بیرونجات میں سرزد ہوتی ہیں۔ جہاں لوگ اپنے حقوق سے اچھی طرح واقف نہیں۔ نیز ہندوستانی والیان ریاست کو بھی ان کے انتظامی امُور سے مطلع کرتا رہے اور حاکم و محکوم میں جو باعث تفرقہ کے ہیں۔ انکو رفع کرنے کے وسائل پیدا کرے۔ غرضیکہ ایک پورا اور سچّا خادم قوم ہو۔

کوہ نُور لاہور کی ایڈیٹری سے قطع تعلق کے بعد ان سب مراتب کے خیال سے میرے احباب نے بالاتفاق بڑے اصرار سے مجھے ایک نئے اردو اخبار کی اشاعت کیلئے ترغیب دی۔ مَیں اپنی نسبت ہرگز وثوق سے نہیں کہہ سکتا

۴۴۔ رفیق ھند (ہفتہ وار) لاہور ۵ جنوری ۱۸۸۴ء بروز شنبہ۔

کہ فی الحقیقت میں ان تمام قومی فرائض کو پورے طور پر ادا کرنے کے قابل ہوں گا جو ایسے اخبار سے مقصود ہونے چاہئیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اگر میری ناچیز خدمات کسی قابل بھی سمجھی جاویں تو میرے لئے اس سے زیادہ فخر کی کوئی بات نہیں کہ اپنے برگزیدہ احباب کے ارشاد اور قومی خدمت کے لحاظ سے اپنے فرائض کو حتی الامکان کامل طور پر پورا کرنے کی کوشش کروں۔ اور چونکہ زبانی جمع خرچ سے قطع نظر کر کے ہر ایک چیز کو اپنی نسبت خود بتانا چاہیئے کہ وہ کیسی ہے۔ اسلئے میں اس بات کا فیصلہ آئندہ کیلئے زیادہ تر پبلک پر چھوڑ دوں گا کہ کہاں تک میں نے اپنے وعدے کے ایفا میں کوشش کی ہے۔

ہندوستان کی موجودہ عام حالت کے بموجب آزادی اور قومی ہمدردی جس قسم کا بھاری جرم سمجھا جاتا ہے۔ اس کے لحاظ سے بخوبی ان مشکلات کی نسبت پیش گوئی کی جا سکتی ہے۔ جو "رفیق ہند" جیسے پرچے کیلئے لاحق ہونی یقینی ہیں۔ پس ایک ایسا قومی اخبار اپنے قائم رکھنے کی کوئی سبیل نہیں رکھ سکتا۔ سوائے اس کے کہ بحیثیت مجموعی قوم ہی اس کی ذمہ داری کو اپنے سر پر لے۔ کیونکہ دیانت اور صداقت کی پوری پابندی کے باعث کوئی ناجائز ذریعہ معاش کا اس کے لئے کھلا نہیں رہ سکتا۔ پس یہ قوم کا فرض ہے کہ وہ اپنے جاں نثار رفیق کی خدمات کی قدر کرے اور ہر ایک عملی ذریعہ اس کے قائم رہنے کا مہیا کرے۔

ہمیں بڑے فخر سے اس بات کے اظہار کا موقع حاصل ہے کہ اس ناچیز پرچہ میں خیالات کی روح ڈالنے کیلئے براہ قومی ہمدردی ہندوستان

کے بڑے بڑے مشاہیر اور اول درجہ کے معلم الثبوت صاحب قلم بہت شوق اور محبت سے آمادہ ہیں۔ اب پبلک کی امداد کے بھروسے پر اس امر کا اعلان دیا جاتا ہے کہ ۵ رجنوری ۱۸۸۴ء سے یہ اخبار سردست بڑی تقطیع کے سولہ صفحوں کی ضخامت میں ہفتہ وار شائع کیا جاتا ہے۔ لہٰذا از جہاں تک اہل وطن حوصلہ دلائیں اس کی ترقی کے دوسرے سامان پیدا کرنے میں سعی کی جائے گی[۴۵]۔"

پہلے مہینے کے چاروں شماروں پر صفحہ نمبر مسلسل لگائے گئے تھے۔ ۲ر فروری ۱۸۸۴ء کے شمارے سے ہر شمارے کے صفحات نمبر الگ الگ ہوتے تھے۔

رفیق ھند کی صحافتی پالیسی پر مفصل بحث کی یہاں گنجائش نہیں لیکن جس طرح ایڈیٹر نے خود اقرار کیا ہے کہ اسے اول درجہ کے معلم الثبوت اہل قلم کا تعاون حاصل ہے۔ بے سبب نہ ہوگا اگر رفیق ھند میں چھپنے والے اہل قلم کا کچھ تذکرہ ہو جائے۔

رفیق ھند کے ایڈیٹر مولوی محرم علی چشتی بی۔ اے خود نہایت عمدہ شاعر اور صاحب طرز ادیب تھے۔ افسوس ہے کہ ہمارے ہاں جس قدر علی گڑھ سکول کی نثر پہ کام کیا گیا ہے۔ اس قدر اہل پنجاب کی نثری کاوشوں کی ارزش یابی سے بے اعتنائی کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر سرسید، ڈپٹی نذیر احمد، محسن الملک، وقار الملک اور حالی کی نثر اردو ادب میں اسلوب کا سنگ میل ہے تو مولوی محرم علی چشتی، مرزا فتح محمد جالندھری، پادری رجب علی، نجم الہند نواب محمد حیات خاں، قادر بخش خاں بہادر اور مولوی غلام قادر فصیح کا اسلوب نثر بھی اردو ادب میں مینار نور کہلانے

۴۵۔ رفیق ھند۔ ۱۲ر جولائی ۱۸۸۴ء ۔ ص ۳۲۔

کا مستحق ہے۔ دراصل ہمارے محققین اور نقادوں کی معلومات کا دائرہ سرسید سکول سے تجاوز نہیں کرتا۔ شاید اسمیں مواد کے نایاب ہونے کا بھی ہاتھ ہو۔ رفیق ہند کا ذکر اردو صحافت کی تاریخوں میں بہت تشنہ ہے۔ مولانا امداد صابری کے ہاں اس کا ذکر خاصی حد تک بہتر ہے[۱۶]۔ لیکن ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اختر شہنشاہی کے حوالے کے علاوہ رفیق ہند کے بارے میں کوئی خاص اطلاع فراہم نہیں کی — یہاں تک کہ ایڈیٹر یعنی مولوی محرم علی چشتی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"انھوں نے منشی ہرسکھ رائے کے ساتھ مل کر انڈین نیشنل سوسائٹی کی بنیاد رکھی[۱۷]"

حقیقت یہ ہے کہ مولوی محرم علی چشتی انجمن اسلامیہ پنجاب کے جائنٹ جنرل سیکریٹری تھے۔ جس کے جنرل سیکریٹری خان بہادر محمد برکت علی خاں تھے۔ چشتی صاحب انڈین نیشنل سوسائٹی کے بدترین مخالفوں میں سے تھے۔ اور رفیق ہند میں اس کے خلاف اکثر مقالات شائع ہوتے تھے۔ اس امر کا ثبوت رفیق ہند کے ۱۸۸۴ء، ۱۸۸۵ء اور ۱۸۸۷ء کے فائیل مہیا کر سکتے ہیں۔ جن کے مطالعہ کا مجھے موقع ملا ہے۔

رفیق ہند ۱۸۸۴ء سے ۱۹۰۵ء تک شائع ہوتا رہا۔ درمیان میں کبھی قلیل اور کبھی طویل مدت کیلئے بند بھی ہو جاتا تھا۔ اس بیس سال کے عرصے میں اس اخبار کو جن نامور اہل قلم کا تعاون حاصل رہا، ان میں سرسید احمد خاں، مولانا محمد حسین آزاد

---

۱۶ - امداد صابری: تاریخ صحافت اردو - (جلد سوم) دہلی ۱۹۶۳، ص ۳۲۰ تا ۳۲۶۔

۱۷ - صحافت پاکستان و ہند میں - ص ۲۸۱

مولانا الطاف حسین حالی ، محسن الملک، سیّد اقبال علی، مولوی ذکاء اللہ، مولوی محمد علی پُھدل ، فقیر سیّد جمال الدین ، مولوی مرزا فتح محمد جالندھری ، مولانا غلام قادر گرامی، ڈاکٹر لائٹنر ، مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی اور سید حسین اغلب قابلِ ذکر ہیں۔

مولوی محرم علی چشتی ہر موضوع پر خوش اسلوبی سے اظہار خیال کی قدرت رکھتے تھے ۔ ان کی طرز نگارش سادہ، عام فہم ، مدلل اور ادبی خوبیوں سے لبریز ہوتی تھی۔ محرم علی چشتی کی نثری کاوشوں کا جائزہ بذاتِ خود ایک مفصل اور جامع موضوع ہے ۔ یہاں بطور مثال ان کے صرف ان مقالات کی فہرست درج کی جاتی ہے جو رفیقِ ہند میں ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئے ۔ چشتی نے صدہا مقالات اور تحریریں یادگار چھوڑی ہیں ، جو ادبی نقطہ نظر سے پنجاب میں اردو ادب کا اہم باب ہیں۔

مولوی محرم علی چشتی کی تحریریں یکم جنوری ۱۸۸۷ء سے ۱۰ ستمبر ۱۸۸۷ء تک :

۱ ۔ ۱۸۸۶ء کا خاتمہ اور ۱۸۸۷ء کا آغاز (ایڈیٹوریل رفیق ہند)

۲ ۔ پبلک سروس کمیشن کے سامنے شہادت ۔

۳ ۔ کلکتہ کانگرس ۔

۴ ۔ اخبار ٹریبون اور پبلک سروس کمیشن ۔

۵ ۔ نیشنل کانگرس اور بعض بنگالیوں کی چالیں ۔

۶ ۔ اہلِ حدیث یا وہابی ؟

۷ ۔ ہندوستان کے حاجیوں کیلیے سہولت اور آسائش کا انتظام ۔

۸ ۔ لکھنوی مسلمان اور نیشنل کانگرس ۔

۹ - ریاست جموں کشمیر کی نئی منسٹری ۔

۱۰ - نیشنل کانگرس اور مسلمان ۔

۱۱ - گورنمنٹ پنجاب کی عنایت مسلمانوں کی حالت پر ۔

۱۲ - مسلمانان لاہور اور جشن جیوبلی ۔

۱۳ - ریاست جموں میں انتظامی زلزلہ ۔

۱۴ - ہوشیار پور کے حالات ۔

۱۵ - پنجاب یونیورسٹی کا عہدہ اسسٹنٹ رجسٹراری ۔

۱۶ - ایک اخبار نویس کی سوانح عمری ۔

۱۷ - ہمارے نئے لاٹ صاحب اور پنجاب کی آئندہ اُمیدیں ۔

۱۸ - تین مسلمان یتیم بچوں کا مقدمہ ۔

۱۹ - شمس العلماء کا خطاب ۔

۲۰ - پنجاب نیٹو پریس ایسوسی ایشن ۔

۲۱ - مدرسہ اسلامیہ امرتسر ۔

۲۲ - دہلی کے مسلمانوں پر آفت ۔

۲۳ - پنجاب میں عید الضحیٰ اور گاؤکشی ۔

۲۴ - انگلستان میں ہندوستانی مہمانوں سے کیسا سلوک ہوا ۔

مولوی محرم علی چشتی : سکھ دور کے ممتاز ادیب اور شاعر ۔ فخر الشعراء مولوی احمد بخش یکدل چشتی کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے ۔ مولوی محرم علی کے سب سے بڑے بھائی مولوی نور احمد چشتی مصنف تحقیقات چشتی اور یادگار چشتی وغیرہ اور منجھلے بھائی مولوی محمد علی پُردل تھے جو اپنے فارسی کلام اور مادہ ہائے

تاریخ کے سبب اپنے زمانے کے قابلِ توجہ شعرا میں شُمار ہوتے تھے۔ مولوی محرم علی ۶ محرم ۱۲۸۰ھ مطابق ۲۳ جُون ۱۸۶۳ء کو پیدا ہُوئے۔ ماہ تولد ہی کی مناسبت سے محرم علی نام رکھّا گیا تھا۔ مولوی یکدل نے مندرجہ ذیل قطعہ میں تاریخ ولادت موزوں کی:

بفضلِ چوں محرم علی ولادت یافت

ششش محرم ویکشنبہ بود از میلاد

ششش محرم ویکشنبہ نیز شد تاریخ

مبارک است عزیزاں بیاں مبارک باد[۴۸]

مولوی محرم علی چشتی کی وفات ۱۹۲۶ء میں ہُوئی۔ رفیق ھند اخبار اور دیوان اشعار (ارمغان چشتی) کے علاوہ "اسلامی زندگی کا دینوی پہلو" اردو نثر میں یادگار ہیں۔ آپ کے بڑے بیٹے مولوی قائم علی چشتی تھے جن کی تربیت پیر مہر علی شاہ گولڑہ والوں نے کی تھی۔ اور انھیں فاضل لاہوری کا خطاب عطا فرمایا تھا۔ چھوٹے بیٹے مولوی ابراہیم علی چشتی تھے۔ جن کی خدمات تحریکِ پاکستان میں ناقابلِ فراموش ہیں۔

رفیق ھند میں مشہور اہلِ قلم کی جو تحریریں شائع ہوئی ہیں ان کی مجمل فہرست درج ذیل ہے۔

سرسید احمد خاں: مقالہ افتتاحیہ رفیق ھند۔

ستارۂ شرقی۔ رمز لطیف۔

---

۴۸ - مقدمہ یادگار چشتی۔ ص ۵۳۔

نیشنل کونگرس میں بدرالدین طیب جی کے خط کا جواب
مبارک باد جشن جیوبلی۔
مسلمانوں کی تعلیمی حالت۔
نیشنل کونگرس کے بارے میں اطلاع۔

مولانا محمد حسین آزاد : مسافر ایران
فرہنگ آصفیہ پر ریویو۔

ڈاکٹر لائٹنر : اسلام اور اسلامی مدارس۔

مولوی ذکا اللہ : فرہنگ آصفیہ پر ریویو۔
مدرستہ العلوم علی گڑھ۔

مولانا الطاف حسین حالی : فرہنگ آصفیہ پر ریویو۔
قصیدہ در تہنیت جیوبلی۔

قادر بخش، خاں بہادر : تعلیم نسواں۔

لالہ لاجپت رائے : پنجابی پریس۔

عبدالحلیم شرر : فرہنگ آصفیہ پر ریویو۔

وحیدالدین سلیم : قومی نوحہ۔

رفیق ہند میں مختلف ادبی اور لسانی موضوعات پر دلچسپ مقالے شائع ہوتے رہے۔ ذیل میں ان مقالات کی ایک فہرست درج کی جاتی ہے۔ جس سے رفیق ہند کی ان اہم خدمات کا اندازہ ہو سکتا ہے جو اس نے اردو ادب کی اشاعت اور ترویج و ترقی میں انجام دیں۔

۱۔ انگریزی محاورات کو اردو میں لانے کا بیان قدسی، عبدالقدوس ۹ فروری ۱۸۸۸ء

نمبر	عنوان	مضمون نگار	تاریخ
۲ -	انگریزی الفاظ کا اردو میں استعمال	عزیز الدین احمد	یکم مارچ ۱۸۸۴ء
۳ -	اردو لٹریچر میں نئے مذاق کی بنیاد	نامہ نگار	" "
۴ -	اردو کی زبان دانی	محرم علی چشتی	۱۵ " "
۵ -	انگریزی اور اردو کا رشتہ	پادری رجب علی	۲۹ " "
۶ -	" " " "	" "	۱۹ اپریل "
۷ -	" " " "	" "	۱۰ مئی "
۸ -	پادری رجب علی اور حضرت قدسی ۔	بجنوری	۷ جون "
۹ -	اردو زبان پر ایک منصفانہ نظر ۔	جوہر	۲۳ اگست "
۱۰ -	ہم اور ہمارا لٹریچر ۔	مہشوار علی گور	۷ مارچ ۱۸۸۵ء
۱۱ -	اردو نظم و نثر کی اصلاح	نواب محمد عمر علی خاں	۱۲ ستمبر "
۱۲ -	ہمارے حکام کی ناواقفیت ہماری زبان سے	محرم علی چشتی	۲۸ نومبر "
۱۳ -	" " " " "	"	۵ دسمبر "
۱۴ -	آداب تحریر	خلیل الرحمٰن	۱۹ جون ۱۸۸۶ء

اس دور کے اہم شعراء جن کے نام رفیق ہند، صحیفہ قدوسی، مشیر ہند، سراج الاخبار، پنجابی وغیرہ اور ان کے معاصرین میں نظر آتے ہیں ۔ درج ذیل ہیں: ان میں سے بعض صاحب دیوان بھی تھے ۔ لیکن ان کے نام اردو ادب میں کافی اطلاعات کے میسر نہ ہونے کے سبب شہرت حاصل نہ کر سکے ۔

۱ - مفتی غلام سرور لاہور
۲ - مفتی غلام صفدر فوقانی
۳ - مفتی غلام اکبر
۴ - منشی سردار علی اختر
۵ - منشی فرید بخش فرید
۶ - سید عطاء اللہ عطا ولایتی

۷ - بابو جے گوپال گوپال
۸ - تارا چند تارا
۹ - مولوی فدا حسین پھدرو
۱۰ - محمد عبدالسلام بادشاہ سلام
۱۱ - مولوی عبدالرحمان چشتی
۱۲ - مولوی محمد علی چشتی پُردل
۱۳ - مولوی سیف الحق ادیب
۱۴ - حافظ عبدالقدوس قدسی۔
۱۵ - منشی اطہر حسین اطہر
۱۶ - مولوی احمد شفیع
۱۷ - مولوی احمد بخش احمد
۱۸ - میر محمد المعی رئیس لُدھیانہ

انیسویں صدی کی ادبی تحریکات میں دو اور تحریکوں کا ذکر بھی ضروری ہے یہ تحریکیں بلاواسطہ کم اور بالواسطہ زیادہ ادب پر اثر انداز ہوئیں ۔ ہماری مُراد انجمن حمایت اسلام اور انجمن اتحاد سے ہے ۔ ان میں انجمن حمایت اسلام بنیادی طور پر اصلاحی ادارہ تھی اور انجمن اتحاد سرتاسر ادبی ، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

انجمن حمایت اسلام ۱۸۸۴ء میں قائم ہوئی معاصر اخبارات کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ شروع میں اس کا دائرہ بے حد محدود تھا اور یہ انجمن چند قوم پرست افراد نے اصلاح معاشرہ کی غرض سے قائم کی تھی اور اس کی مُلکی یا قومی حیثیت وہ نہ تھی جو انجمن اسلامیہ پنجاب کو حاصل تھی ۔ حنیف شاہد کی تحقیق کے مطابق انجمن حمایت اسلام کے چار بنیادی مقاصد تھے ۔

۱ - عیسائیوں کی تبلیغ کا سدِباب کرنا ۔

۲ - مسلمانوں کی تعلیم کیلئے ایسے ادارے قائم کرنا جن میں قدیم و جدید دونوں قسم کے علوم کی تعلیم دی جائے ۔

۳ - مُسلمانوں کے یتیم و لاوارث بچوں کیلئے ایسے ادارے قائم کرنا جن میں پرورش

کے علاوہ ان کی تعلیم و تربیت بھی کی جائے۔

۴۔ اسلامی لٹریچر کی اشاعت۔[۹۴]

اس میں چوتھا مقصد اگرچہ ادب کے بارے میں ہے لیکن انجمن کی اصل سرگرمیاں مسلمانوں کی تعلیم اور معاشرتی مسائل کو حل کرنے تک محدود ہیں۔ ادب کی طرف توجہ رہی لیکن بہت بعد یا دوسرے الفاظ میں غیر مستقیم۔

انجمن حمایت اسلام کے بانیوں میں خلیفہ حمید الدین، مولوی غلام اللہ قصوری جیسے جید علماء کے نام نظر آتے ہیں۔ یہ دونوں حضرات اپنے زمانے کی بلند پایہ اور اہم ترین شخصیتوں میں سے تھے۔ انجمن حمایت اسلام ۱۸۸۴ء سے آج تک قائم ہے۔

انجمن حمایت اسلام کی ادبی اہمیت اس اعتبار سے ہیں کہ اس نے انجمن پنجاب وغیرہ کی طرح ادب کے فروغ میں براہِ راست حصہ لیا بلکہ اس لئے ہے کہ انجمن نے اردو ادب کے نامور اور ممتاز اہلِ قلم کو انجمن کے جلسوں میں آکر عوام سے براہِ راست تعلق پیدا کرنے کی دعوت دی۔ اسی طرح انجمن نے اردو ادب کو ایک ایسا ماحول اور پلیٹ فارم مہیا کیا جو پنجاب میں اس کی نشو نما کا باعث ہوا۔ انیسویں صدی میں سرسید اور ان کے رفقاء انجمن کے کاموں سے دلچسپی لیتے رہے۔ چنانچہ ۱۸۹۳ء میں جب مولوی نذیر احمد لاہور آئے تو انجمن حمایت اسلام نے ان کے لیکچر کا انتظام کیا۔ مولوی صاحب کی سخن گسترانہ باتوں نے پنجاب کے مسلمانوں میں جو اختلافِ نظر پیدا کیا۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں کیونکہ معاصر اخبارات اس کے شاہد ہیں لیکن انجمن حمایت اسلام نے پھر بھی مہمان عزیز کے احترام میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔

۹۴۔ حنیف شاہد: اقبال اور انجمن حمایت اسلام، لاہور، کتب خانہ انجمن حمایت اسلام ۱۹۷۲، ص ۲۵

بیسویں صدی کی اہم ادبی شخصیتوں میں علامہ اقبال کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ علامہ اقبال کی انجمن سے تعلق کی مفصل داستان حنیف شاہد کی کتاب میں موجود ہے ۔ جب وہ بحیثیت شاعر کے عوام میں متعارف ہو رہے تھے انھیں اپنی معروف ترین زندگی تک جب کہ وہ بحیثیت مفکر کے عالمی شہرت اختیار کر چکے تھے ۔ انجمن حمایت اسلام سے کسی نہ کسی صورت میں وابستہ رہے ۔ علامہ مرحوم انجمن کے جلسوں میں قومی بیداری کی نظمیں سناتے تھے ۔ اور انہی جلسوں کے ذریعے سے قومی بیداری کی تحریکوں کی رہنمائی بھی کرتے تھے ۔ علامہ انجمن حمایت اسلام کے عہدے دار بھی رہے ۔ لیکن اس سے زیادہ انجمن کے وسیلے سے عوام تک پہنچائے جانے والے ان منظوم پیغامات کی اہمیت ہے جنھوں نے مسلمانانِ ہند و پاکستان کی قومی زندگی میں اہم کردار ادا کیا اور تحریک پاکستان کا پیش خیمہ بنے ۔

انجمن حمایت اسلام کیساتھ وقتاً فوقتاً بے شمار ادیبوں کا تعلق رہا لیکن ہمارے موضوع میں جن شخصیتوں کا ذکر آتا ہے جنھوں نے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں کو اپنے اور عوام کے درمیان اظہار و ابلاغ کا وسیلہ بنایا ان کی فہرست درج ذیل ہے ۔

۱۔ شمس العلماء مولوی محمد عبداللہ ٹونکی
۲۔ نواب سر محمد ذوالفقار علی خاں
۳۔ خان بہادر سر شیخ عبدالقادر
۴۔ مرزا عبدالغنی ارشد گورگانی
۵۔ مولوی احمد دین وکیل
۶۔ نواب سراج الدین سائل دہلوی ۔
۷۔ مولانا ابوالکلام آزاد
۸۔ مولانا الطاف حسین حالی ۔
۹۔ خواجہ دل محمد ایم ۔ اے
۱۰۔ نواب وقار الملک ۔

۱۱ - مولوی اصغر علی روحی

۱۲ - نذیر احمد دہلوی

۱۳ - مولانا شبلی نعمانی

۱۴ - نواب محسن الملک

۱۵ - سرسید احمد خاں

۱۶ - خان بہادر محمد برکت علی خاں

۱۷ - جسٹس میاں محمد شاہ دین ہمایوں

۱۸ - مولوی سید ممتاز علی

۱۹ - میر غلام بھیک نیرنگ

۲۰ - چوہدری خوشی محمد ناظر

۲۱ - سید ناظر حسین ناظم

۲۲ - مولانا سید سلیمان ندوی

۲۳ - مولانا غلام قادر گرامی

یہ فہرست نامکمل ہے ان میں اور بے شمار ناموں کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور اہم ادبی انجمن کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا یہ انجمن اتحاد کے نام سے یاد کی جاتی ہے اور اس کی مختصر روداد یہ ہے۔

انجمن اتحاد کا قیام انجمن پنجاب کے بعد عمل میں آیا۔ یہ انجمن ۱۸۹۰ء میں قائم ہوئی۔ انجمن اتحاد کو دو اعتبار سے انجمن پنجاب کا ردِ عمل کہا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ یہ انجمن جو بنیادی طور پر بزمِ مشاعرہ تھی، شاعری کے ان اصولوں پر سو فیصد قائم نہ تھی جو انجمن پنجاب میں شعری ادب کی بنیاد تھے۔ مثلاً نیچرل شاعری' دوسرا یہ کہ انجمن پنجاب کے برعکس انجمن اتحاد ایک نجی اور خالص شخصی دوستانہ فضا میں قائم کی گئی تھی۔ اس پر کسی لحاظ سے سرکاری سرپرستی کا لیبل نہ تھا۔

لاہور کی شعری فضا کو ایک ایسا محاذ درکار تھا جو تکلفات سے الگ ہو۔ فن کار اور قاری کے درمیان کسی قسم کی دوری نہ ہو۔ بالآخر لاہور میں انجمن اتحاد کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے ارکان کا تعلق انجمن پنجاب سے بالکل معمولی تھا۔ اس انجمن میں اس قدر کشش تھی کہ انجمن پنجاب سے متعلق تمام اساتذۂ فن اس میں شامل ہو گئے۔ اس انجمن کے قیام سے ایک سوال ذہن میں آتا ہے کیا

یہ انجمن پنجاب کے مقابلے میں قائم ہوئی۔ کیونکہ اس کے مشاعروں میں اکثر غزل گو شعراء نظر آتے ہیں۔ یا ان پرانی وضع کے اساتذہ کی شرارت ہو جو جدید نظمیں لکھتے ہوئے تکلیف محسوس کرتے تھے۔ کیونکہ ان کی یہی شعری روایات جیسے وہ برسوں سے اپنائے ہوئے تھے خطرے میں نظر آ رہی تھیں۔ کیونکہ یہ بات تو ظاہر ہے کہ انجمن پنجاب کے مشاعرے جدید شاعری کے رجحانات کی نمائندگی کرتے تھے۔ اس کے برعکس انجمن اتحاد پر قدیم شعری تصورات کی حکومت تھی اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ انجمن اتحاد کے ناموں میں آزاد کا کہیں تذکرہ نہیں۔

انجمن اتحاد کے بانی حکیم شجاع الدین محمد مشہور ادیب حکیم احمد شجاع کے والد تھے یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب باہر کے اساتذہ مقامی شعراء سے اچھی طرح روشناس ہو چکے تھے اور ان سے اپنی قادر الکلامی کا لوہا منوا چکے تھے۔ مرزا ارشد گورگانی دبستان دہلی کے نمائندہ اور قدیم شعری روایات کو عزیز جانتے تھے۔ ناظر حسین ناظم لکھنوی دبستان کی علامت تھے۔ وہ اپنی شعری اصولوں اور نظریوں کو ایمان سمجھتے تھے۔ دونوں بزرگ شعر و سخن کا ذوق رکھنے والوں کے درمیان ارشد اور ناظم الگ الگ شعری اداروں کی حیثیت رکھتے تھے۔ فقرے بازی کے ساتھ ساتھ ادب و احترام کا خیال رکھا جاتا۔ اس سے لاہور کی شعری فضا کو یہ فائدہ ہوا کہ یہ دہلوی اور لکھنوی رنگ شعر کا مرکز بن گیا۔ اس شعری تربیت میں شاعری کی تربیت یوں ہوئی کہ خیال اور لفظ یا جذبے اور لفظ دونوں پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ گویا اس نے شعر میں اثر آفرینی، گداز دبستان دہلی سے لیا اور لفظوں کے پینترے لکھنوی دبستان سے سیکھے۔ دو مزاجوں کے خوبصورت ملاپ نے شعری روایات کو ایک نیا رنگ دیا۔

انجمن اتحاد کا مشاعرہ ہر ہفتے حکیم شجاع الدین محمد کے مکان پر منعقد ہوتا تھا

اور اس کی اشاعت ماہنامہ "شورِ محشر" میں ہوتی تھی۔ اس رسالے کے مدیر خان احمد حسین خان تھے۔

ایک اور فائدہ جو اس انجمن کا ہوا وہ یہ تھا کہ انجمن اتحاد کا مشاعرہ بہت جلد ایک قابل تقلید روایت بن گیا۔ اس ادبی محفل کی تقلید میں شعر و سخن کی کئی محفلیں معرضِ وجود میں آ گئیں۔ ان تمام مجالس کا مرکز بھاٹی دروازہ لاہور کے اندر بازار حکیماں تھا۔

لاہور کی شعری روایات میں بھاٹی دروازے کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اقبال بھی بقول مولانا عبدالمجید سالک بھاٹی دروازے کے اندر محلہ جلوٹیاں میں سکونت اختیار کئے ہوئے تھے۔

انجمن اتحاد کا مشاعرہ بازار حکیماں میں ہوتا تھا جسمیں مرزا ارشد گورگانی۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری، ناظم لکھنوی، حکیم شہباز الدین، حکیم محمد امین، سر عبدالقادر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ انجمن اتحاد اور بھاٹی دروازے اور بھاٹی دروازے کی دیگر ادبی مجالس کے بارے میں حکیم احمد شجاع کی یادداشت ہر لحاظ سے اہم ان صحبتوں کا نقشہ انھیں کے الفاظ میں دیکھیں۔

"۱۸۹۰ء میں میرے والد حکیم شجاع الدین نے اردو زبان کی روز افزوں ہر دلعزیزی سے متاثر ایک اردو بزمِ مشاعرہ (انجمن اتحاد) کی بنیاد ڈالی ۔ ۔ ۔ ۔ جب تک میرے والد زندہ رہے یہ بزمِ مشاعرہ قائم رہی۔ مرزا ارشد دلی اسکول اور میر ناظم لکھنو کی زبان کے دلدادہ ۔ ۔ ۔ ۔ دونوں ٹولیاں جب اس بزمِ مشاعرہ میں اپنا اپنا رنگ جمانے کیلئے مصروفِ غزل خوانی ہوتی تھیں تو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے انیس اور دبیر کی رقابت کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس زمانے

میں بھی پنجاب کے شعراء میر اور میرزا ہی کے زیرِ قیادت میدانِ سخن طرازی میں ایک دوسرے سے مصروف پیکار رہتے تھے . . . جب تک یہ ہنگامہ رہا، شورِ محشر قیامت برپا کرتا رہا۔[۵۰]

۱۸۹۶ء کے آخر میں میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ شورِ محشر بھی جاری نہ رہ سکا . . . مگر جن کو ایک دوسرے کی صحبت سے لطف اندوز ہونے کی کچھ عادت ہو گئی تھی - اب ہر روز ہمارے مکان پر جمع ہو جاتے — سر عبد القادر، سر محمد اقبال، سر شہاب الدین، خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش، خلیفہ نظام الدین، شیخ گلاب دین، مولوی احمد دین، مولوی محمد حسن جالندھری، مفتی عبد اللہ ٹونکی اور سید محمد شاہ وکیل" . . . . . .

اسی زمانے میں اس ادبی محفل کی تقلید میں شعر و سخن کی کئی نئی محفلیں وجود میں آئیں - مرزا اعظم بیگ جو لاہور کے مقتدر رئیس تھے ان کے بیٹے اسلم بیگ کو شاعری کا ذوق وافر تھا اور وہ میر ناظر حسین ناظم کے تلامذہ میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد اس قدر دولت ان کے ہاتھ آئی کہ وہ لکھ لٹ مشہور ہو گئے - اس لوٹ میں ان کے ذوقِ سخن کو بھی کافی مالِ غنیمت ملا - انھوں نے اپنی حویلی میں ایک محفلِ مشاعرہ قائم کی جس کے میرِ مشاعرہ ان کے استاد تھے . . . "

---

۵۰ - یہ اقتباسات حکیم احمد شجاع کے مقالے "لاہور کی پرانی صحبتوں" سے اخذ کیے گئے ہیں۔ حکیم صاحب نے یہی جملے اپنی کتاب "خوں بہا" میں بھی لکھے ہیں۔ دیکھیے "خوں بہا" ص ۱۹۷ -

مرزا اسلم بیگ کی وفات کے ساتھ یہ محفل سُونی ہو گئی اور اب یہ اکھاڑہ میاں سراج الدین کی حویلی "ریاض منزل" میں جمنے لگا۔ کشمیری بازار کے عقب میں ایک محلہ ہے جسے کوٹھی داروں کا کوچہ کہتے ہیں۔ ریاض منزل اسی کوچے میں واقع ہے۔ اگرچہ اس محفل کے کارفرما بھی میر ناظم حسین ناظم تھے۔ لیکن اس کا نقشہ میرزا اسلم بیگ محفلِ شعر و شاعری سے جداگانہ تھا۔ اس میں حکیم بہادر شاد، سید سردار حسین، میر حسین علی اور حکیم فقیر محمد بڑی نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اقبال اور ان بزرگوں کی محفل بازارِ حکیماں میں ہی جمتی تھی۔ یہاں ادبی مشاغل کا چرچا تھا اور دوسری محفلوں میں کاکل زلف کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔"

۱۹۱۲ء میں جب نواب سر ذوالفقار علی خاں پٹیالے سے آ کر لاہور میں مُقیم ہُوئے تو ان کی اقامت گاہ جو "زر افشاں" کے نام سے موسوم تھی۔۔۔ ایک ادبی محفل کا مرکز بن گئی۔ اب اقبال کی آمد و رفت اس طرف شروع ہو گئی۔ اس بزم کی شرکت کی مسرتوں سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے حضرت گرامی بھی اکثر جالندھر سے لاہور آ جاتے تھے۔ جب وہ آتے تو اقبال بالالتزام ہر شام زر افشاں میں جاتے۔ کبھی گرامی سے ان کا کلام سُن کر اور کبھی گرامی کو اپنا کلام سُنا کر ایک دُوسرے سے دادِ سُخن پاتے۔[۵۱]

بھاٹی دروازے کی ادبی اہمیت علامہ اقبال کے اس شعر سے بخوبی واضح

---

۵۱ ۔ ماہنامہ ادب لطیف ۔ لاہور کی پُرانی ادبی محفلیں ، لاہور ۱۹۶۵ء

ہوتی ہے۔

بھاٹی دروازے کی جانب ایک دن جاتا تھا میں

شام کو گھر بیٹھے رہنا قابلِ الزام تھا [۵۲]

انیسویں صدی کے ان مشاعروں نے لاہور میں جن شخصیتوں کو ادبی تربیت سے نوازا اس میں سرِ فہرست اقبال کا نام ہے۔ اس کے علاوہ وجاہت جھنجھانوی سید غلام بھیک نیرنگ، شاہ دین ہمایوں، فوق، منشی محمد ناظر، غلام قادر وغیرہ بھی قابلِ ذکر ہیں۔

یہ لاہور میں جو کہ پنجاب کا دل ہے۔ اردو شاعری کے ان ادوار کی روئیداد ہے جو کہ کم و بیش ایک سو سال کے عرصے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

بیسویں صدی کا آغاز ادبی صحافت، ادبی تحریکات اور نئے ادبی اسالیب کے فروغ کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بیسویں صدی کا آغاز ادب میں ایک نہایت اہم واقعہ کے ساتھ ہوا۔ اور وہ واقعہ "رسالہ مخزن" کا اجراء ہے۔ مخزن محض ایک ماہنامہ یا ادبی آرگن کا نام نہیں، بلکہ مخزن ایک ایسی تحریک کا نام ہے جس کے وجود میں صدہا رجحانات نے جنم لیا۔ مخزن ایک ایسے گہوارے کا نام ہے جس کی آغوش میں صدہا اہلِ قلم نے پرورش پاکر فضائے علم و ادب کو منور کیا۔

مخزن کا پہلا شمارہ ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا۔ ناشر اور مدیر شیخ عبدالقادر بیرسٹر تھے۔ کچھ عرصہ بعد شیخ صاحب لندن چلے گئے تو مخزن شیخ محمد اکرام کی ادارت میں بڑی کامیابی

۵۲۔ شیخ اسماعیل پانی پتی۔ نقوش لاہور نمبر ص ۹۱۴۔

کے ساتھ شائع ہوا۔ ۱۹۰۷ء میں شیخ عبدالقادر لندن سے واپس آئے۔ دہلی میں وکالت شروع کی اور مخزن دہلی میں منتقل ہو گیا۔ اس دور میں بھی شیخ محمد اکرام ادارت میں ان کے شریک رہے۔ شیخ محمد اکرام کے سفر انگلستان پر رسالے کی ادارت علامہ راشد الخیری کے سپرد ہوئی۔ ۱۹۱۰ء میں شیخ عبدالقادر مخزن کو دوبارہ لاہور لے آئے۔ ۱۹۱۶ء تک چھ سال یہ رسالہ بحران کا شکار رہا۔ لیکن چونکہ ادارت اور مالکیت سر عبدالقادر کے ہاتھ میں ہی رہی۔ لہٰذا سر عبدالقادر کا ادبی معیار اور ذوق سلیم اس دور تک نمایاں طور پر رسالے میں موجود نظر آتا ہے۔ ۱۹۱۷ء سے مخزن مولانا تاجور نجیب آبادی کے ہاتھ میں چلا گیا۔ جن کا حلقہ ادبی اور زاویہ نگاہ سر عبدالقادر سے مختلف تھا۔ اس سال سے مخزن کا دور ثانی شروع ہوا جو ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

مخزن کے ابتدائی حلقہ ادب میں جن ممتاز شخصیتوں کے نام نظر آتے ہیں۔ ان میں سر عبدالقادر کے علاوہ مولانا شاہ دین ہمایوں، غلام بھیک نیرنگ، منشی احمد دین علامہ سر محمد اقبال، نورالدین عنبر، مولانا حسرت موہانی، نادر کاکوروی اور احمد خاں تاباں کے نام قابل ذکر ہیں۔ علامہ اقبال مخزن کے مستقل لکھنے والوں میں سے تھے اور یہ تعلق اس وقت تک برابر قائم رہا، جب تک سر عبدالقادر اس کے ایڈیٹر رہے اور جس وقت سے سر عبدالقادر کا نام بطور مدیر مخزن پر شائع ہونا بند ہوا، علامہ نے بھی اس سے تقریباً اپنا رابطہ منقطع کر لیا۔

۱۹۰۵ء تک مخزن کی فہرست میں چند ناموں کا اضافہ نظر آتا ہے اور وہ ہیں: چودہری خوشی محمد ناظر، عبدالرشید چشتی، ارشد گورگانی، مولانا ظفر علی خاں، سرور جہان آبادی، منشی ذوالفقار علی گوہر، شیخ محمد اکرام اور بدرالدین قیصری۔ اس

زمانے تک شعراء کی محفل میں اقبال کو خاص اہمیت حاصل ہو چکی تھی۔ اپریل ۱۹۰۰ء کے ایک شمارے میں بدرالدین قیصری نے اقبال پر ایک نظم لکھی۔ جس کا پہلا بند تھا:

مرحبا اقبال اس جادو بیانی پر تری　　　حبذا طرز جدید شعر خوانی پر تری

واہ واہ ایسی طبیعت کی روانی پر تری　　　آفریں اس نقطہ دانی نکتہ رانی پر تری

شمع ہے تو شاعری کی انجمن کے واسطے

فکر تیرا دام ہے مرغ سخن کے واسطے

مخزن کی ادبی محفلوں کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں قدیم و جدید ہر دو طرز فکر اور اسلوب تحریر کے لکھنے والے شامل ہوئے تھے۔ نیچرل شاعری کے نمائندے جن کا فکری سلسلہ انجمن پنجاب کے مشاعروں سے ملتا تھا، قدیم شاعری اور فکر کے نمائندے جو نثر میں تاریخ اور تحقیق سے دلچسپی رکھتے تھے اور شاعری میں اساتذہ کے تتبع میں کہی ہوئی غزل سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ جدید طرز تفکر کے ادیب جو انگریزی ادب اس کے اسالیب سے متاثر تھے۔ غرضیکہ ہر مکتب خیال کی نمائندگی مخزن کے صفحات پر نظر آتی ہے۔ بطور مثال اقبال جو فکر جدید کی علامت سمجھے جاتے تھے اور ان کے کہن سال استاد مرزا ارشد گورگانوی دونوں کے ادب پارے مخزن کی زینت تھے۔

مخزن کی دوسری قابل ذکر خصوصیت یہ تھی کہ اس میں صرف نامور ادیبوں یا مشہور لکھنے والوں کو ہی قابل اشاعت نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ بساط ادب پر تازہ واردان کو بھی خاص طور پر اہمیت دی جاتی تھی۔ گویا مخزن اگر ایک طرف اردو ادب کے قدیم یا مروج رجحانات کا ریکارڈ تھا تو دوسری طرف ادب کے مستقبل کا نباض بھی تھا۔ مخزن کے لکھنے والوں میں بخت بہادر بخت، صادق، محمد شفیع مظہری، محمد

شفیع مشتاق، حبیب کنتوری، محمد ابراہیم اثمک، کاظم حسین محشر، محمد ہادی کمال عنایت حسین امداد اور محمد فضل رب فضل ایسے نام ہیں جنہیں اردو ادب کی تاریخ آج فراموش کر چکی ہے۔ لیکن اقبال، فصیح دہلوی اور پیارے لال شاکر نظم کی صنف میں آج بھی جانے پہچانے ہیں۔ مخزن کے عام ادبی رویوں پر بحث کے بعد اقبال کے علاوہ جن کی ادبی شخصیت محتاج تعارف نہیں ان نامور ادیبوں کا تعارف بے محل نہ ہوگا جنہوں نے مخزن کی آغوش میں تربیت پائی اور جن کی نگارشات آج اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان سوانحی خاکوں کے لکھنے میں رسالہ نقوش کے لاہور نمبر میں سے شیخ اسماعیل پانی پتی مرحوم اور سید عابد علی عابد مرحوم کے مقالات سے بطور خاص مدد لی گئی ہے۔

۱۔ سر عبد القادر :۔

۱۸۷۴ء میں لدھیانہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم قصور میں حاصل کی۔ بی اے کی ڈگری لاہور سے حاصل کرنے کے بعد منٹگمری کے کسی سکول میں مدرس ہو گئے۔ ۱۸۹۸ء میں آبزرور کی ادارت سے صحافتی اور ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ ۱۹۰۱ء میں مخزن جاری کیا۔ ۱۹۰۴ سے ۱۹۰۷ تک لندن میں رہے جہاں سے بیرسٹری کی سند حاصل کی۔ واپسی میں کچھ دیر دہلی میں وکالت کی، پھر لاہور آگئے اور کچھ عرصے کے بعد لائل پور میں سرکاری وکیل مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں لاہور ہائی کورٹ میں جج کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۱۹۲۵ء میں پنجاب کے وزیر تعلیم مقرر کیے گئے۔ ۱۹۲۷ء میں سر کا خطاب ملا۔ ۱۹۳۴ء میں وزیر ہند کی کونسل کے ممبر بن کر لندن چلے گئے جہاں سے ۱۹۳۹ء میں مراجعت کی۔ ۱۹۴۲ء میں بہاولپور کے چیف جسٹس مقرر ہوئے اور ۱۹۵۰ء میں وفات پاکر لاہور میں سپرد خاک ہوئے۔

سر عبدالقادر کی ادبی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ وہ خود اعلیٰ پایے کے ادیب اور صاحبِ طرز نثر نگار تھے۔ اور ان کی ذات ادبی ماحول کو وسعت دینے میں مددگار ہوئی تھی۔ وہ ادیب، ادیب ساز اور ادیب نواز تھے۔ انھوں نے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھا ہے۔ "اردو ادب کا نیا دلبستان" کے نام سے ان کی انگریزی تصنیف اردو ادب میں تحقیق اور تنقید کا اعلیٰ معیار پیش کرتی ہے، علاوہ ازیں ادبی موضوعات پر درجنوں مقالات ان کے بلند پایہ ادب شناس ہونے کا ثبوت ہیں۔ سید عابد علی عابد نے سر عبدالقادر کو مولانا محمد حسین آزاد کی ردیف میں کھڑا کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "پنجاب میں اردو جس طرح پروان چڑھی ہے اس میں پہلا حصہ آزاد کا ہے اور دوسرا شیخ عبدالقادر کا"[۵۳]۔

۲ - میاں شاہ دین ہمایوں :-

۱۲ ر اپریل ۱۸۶۸ کو باغبان پورہ لاہور میں پیدا ہوئے۔ بی۔ اے تک لاہور میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد انگلستان چلے گئے۔ جہاں سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کر کے واپس آئے اور پہلے عدالت عالیہ کے جج اور پھر چیف جج کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۲ - جولائی ۱۹۱۸ء کو فوت ہوئے، علامہ اقبال نے درج ذیل قطعہ تاریخ موزوں کیا :

در گلستانِ دہر ہمایونِ نکتہ سنج — آمد مثال شبنم و چوں بوئے گل رمید
می جُست عندلیب خوش آہنگ سال فوت — علامہ فصیح زہر چار سو شنید

۱۳۳۶

---

۵۳ - چند بڑے ادیب - نقوش لاہور نمبر ص ۱۰۷

علامہ فصیح کے ۳۳۴ اعداد کو چار سے ضرب دیں تو سالِ وفات یعنی ۱۳۳۶ھ برآمد ہوتا ہے۔
ہمایوں کا شعری مجموعہ ان کے لائق فرزند میاں بشیر احمد زار نے مرتب کیا تھا۔

۳۔ غلام بھیک نیرنگ :۔

ضلع انبالہ کے رہنے والے تھے۔ تعلیم گورنمنٹ کالج لاہور میں حاصل کی۔ زمانہ طالب علمی سے لاہور کی علمی، ادبی اور قومی تحریکوں کے سرگرم رکن تھے۔ علامہ اقبال سے ان کی رفاقت لاہور کے قدیم مشاعروں سے لے کر علامہ صاحب کی وفات تک رہی۔ بہت اچھے شاعر اور ادیب تھے۔ ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۰ء تک انبالے میں سرکاری وکیل رہے۔ آزادی کے بعد لاہور میں مستقل سکونت اختیار کی اور یہیں ۱۶ راکتوبر ۱۹۵۲ء کی رات کو فوت ہوئے[۵۴]۔

۴۔ مولانا ظفر علی خاں :۔

۱۲۹۰ھ میں پیدا ہوئے، سن پیدائش نام سے نکلتا ہے۔ ابتدائی تعلیم وزیر آباد میں حاصل کر کے علی گڑھ کالج سے بی اے پاس کیا۔ ایک سال تک بمبئی میں رہ کر نواب محسن الملک کے معتمد خصوصی کے طور پر فرائض انجام دیتے رہے پھر دکن چلے گئے جہاں ہوم آفس میں مترجم ہو گئے۔ اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے لیجسلیٹو کونسل کے مستقل رجسٹرار قرار پائے۔ آپ کے والد زمیندار اخبار نکالتے تھے۔ والد کی وفات کے بعد زمیندار کی ادارت مولانا ظفر علی خاں کے ہاتھ آ گئی۔ اسی اخبار کے ذریعے آپ نے اردو صحافت میں بلند مقام حاصل کیا اور بابائے صحافت کہلائے۔ نظم و نثر میں یکساں

۵۴۔ عبداللہ قریشی، مکاتیب اقبال بنام گرامی کراچی۔ اقبال اکاڈمی ۱۹۶۹، ص ۲۲۶

قدرت رکھتے تھے۔ انہوں نے اردو میں موضوعاتی شاعری کو حدِ کمال تک پہنچایا اور صحافت میں موضوعاتی نظموں کی اہمیت اور محبوبیت پیدا کی[55]۔

۵ - مولوی انشاء اللہ انشاء:

۲۰ اپریل ۱۸۷۰ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۹۲۸ء میں لاہور میں انتقال ہوا۔ ۱۹۰۱ء میں آپ نے لاہور سے اخبار "وطن" جاری کیا۔ وطن اخبار ۱۹۳۰ء تک جاری رہا۔ مولوی صاحب نے بے شمار کتابیں لکھیں جن میں سے بیشتر تاریخ کے موضوع پر ہیں[56]۔

۶ - عبدالرشید چشتی:

مولوی عبدالرشید دو واسطوں سے مولوی احمد بخش یکدل چشتی کی اولاد میں سے تھے۔ یعنی مولوی عبدالرشید بن مولوی حامد علی چشتی بن مولوی محمد علی پُردل بن فخرالشعراء مولوی احمد بخش یکدل۔ مولوی عبدالرشید اپنے زمانے کے مشہور ادیبوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ آبزرور کے نائب مدیر بھی رہے۔ زیادہ تحریریں انگریزی میں ہیں۔ میاں شاہ دین ہمایوں، سر عبدالقادر اور غلام بھیک نیرنگ کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں عین جوانی کے عالم میں فوت ہوئے۔ نیرنگ نے بہت دردناک مرثیہ لکھا۔ عبدالرشید کے سوانح حیات پر مشتمل ایک کتاب "حیات رشید" چھپ چکی ہے۔ جس کے مؤلف میرزا اعجاز حسین ہیں[57]۔ عبدالرشید چشتی کے

---

۵۵ - نسیم رضوانی۔ شعرائے پنجاب، گجرات، ۱۹۳۷ - ص ۴۴۔

۵۶ - ایضاً ص ۳۲۔

۵۷ - میرزا اعجاز حسین۔ حیات رشید، لاہور۔ رفاہ عام سٹیم پریس، ۱۹۰۹ء

مشہور مقالات درج ذیل ہیں:

۱۔ انگلستان کی تاریخ پر ایک سرسری نظر۔
۲۔ مشرقی اور مغربی زندگی کا مقابلہ۔
۳۔ سرسید مرحوم کی یادگار۔
۴۔ سید احمد خانی گدی۔
۵۔ سرسید کی برسی۔
۶۔ بچوں کے اخبار کی مبارک۔

پانچواں باب

تلخیصات و توضیحات

پانچواں باب

تلخیصات و توضیحات

۱۸۴۹ء یعنی الحاق پنجاب کے بعد اہل پنجاب کی سیاسی، فکری اور اجتماعی زندگی کا خورشید نئے افق سے طلوع ہوا۔ سکھ دور کے خاتمے کیساتھ پنجاب کے مقامی ادب کا خاتمہ نہیں ہوا، بلکہ ان ادبیات پر مغل تہذیب اور فارسی ادب کی جو چھاپ موجود تھی، اس کے نقش آہستہ آہستہ دھندلے ہونے لگے تھے۔ سکھ دور کے آخری ایام میں جو اخلاقی انحطاط اہل پنجاب کی روزمرہ زندگی میں دبے پاؤں داخل ہو رہا تھا، انگریزی عملداری نے اسکو برسرِعام رواج دیا۔ انگریزی مصنوعات کی فراوانی اور انگریز حسینوں کے بے حجاب نظارے پنجاب کی عمومی زندگی میں نیا تجربہ تھے۔ عوام تو ایک طرف خود خواص جو انگریزی تہذیب سے متنفر اور انگریزی افکار کو گمراہی اور تباہ کاری کا سامان سمجھتے تھے، لاشعوری طور پر اس نئی صورتِ حال کو اپناتے دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزوں کے سب سے بڑے مخالف مولوی احمد بخش یکدل ایک روز اپنے دوست میر عبداللہ مترجم[1] کے ہاں دو انگریزوں سے ملتے ہیں اور ان کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"و صاحب بہادر با فقیر طریق محبت و سلوک کردہ و "چُرٹ" یعنی بتّی تمباکو بمن دادہ و بند کشیدہ و آتش ہر دو صاحبان بدست گرفتہ و تعظیم من کردہ۔"[2]

۱۔ میر عبداللہ: انگریز ریذیڈنٹ کے دفتر میں مترجم تھے۔

۲۔ بیاض یکدل نمبر ۱۳۔ ورق ۱۱۴۔

اس اقتباس میں یکدل نہ صرف انگریز کے مہذب رویّے کی تعریف کر رہے ہیں بلکہ انگریز کے لائے ہوئے سیگار کو بھی بڑے شوق سے پیتے ہیں۔

یکدل نے ہی جا بجا انگریزی عورتوں کے بارے میں اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ انہوں نے نہ صرف مردوں کے اخلاق کو فاسد کر دیا ہے، بلکہ پنجاب کی عورتیں بھی ان کی دیکھا دیکھی پردہ نشینی کو ترک کر رہی ہیں۔ انگریزی فیشن کی پیروی کی اہم مثالیں اس دور کے ادب میں بھی ملتی ہیں۔ ادیب اور شاعر اس زمانے میں انگریزی الفاظ کو اپنی فارسی اور اردو تحریروں میں جگہ دے رہے تھے۔ یہ عمل شعوری سطح پر کم اور غیر شعوری طور پر زیادہ تھا۔ چنانچہ پنجاب کے اہم مصنفین میں سے امین چند (سفرنامہ پنجاب) مولوی نور احمد چشتی (تحقیقات چشتی، یادگار چشتی وغیرہ) مفتی علی الدین (عبرت نامہ) مفتی غلام سرور لاہوری (مخزن تاریخ پنجاب وغیرہ) اور امرناتھ اکبری (دیوان اشعار اکبری) کے ہاں انگریزی الفاظ کا استعمال اس دور کے رجحان کی وضاحت کرتا ہے۔ امرناتھ اکبری کا یہ شعر بطور مثال قابل توجہ ہے:

جنرل و ڈپٹی و اسسٹنٹ کمشنر ہر یک
یہ خیالی تھے کہ ہے قدرت یزداں سہرا [۳]

الحاق پنجاب کے وقت پنجاب کے ہر حصے میں شعر و ادب کے مراکز موجود تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سکھوں کی درباری زبان فارسی ہونے کے سبب سے پنجاب کے اکثر نامور اہلِ قلم زیادہ تر فارسی زبان کو اپنی علمی و ادبی کاوشوں کا ذریعہ قرار دیتے تھے، لیکن جہاں سکھ دور کے ممتاز اردو شعراء حکیم نتھو شاہ، فخر الشعراء یکدل،

۳۔ امرناتھ اکبری: دیوان اکبری، لاہور، کوہ نور ۱۸۷۳ء، ص ۱۱۵

امرناتھ اکبری اور نورالدین منور وغیرہ پنجاب میں اردو کے دامن کو ادب پاروں سے مزین کر رہے تھے وہاں ہر چند کہ محدود اور ذاتی سطح پر لیکن اردو نثر بھی ادبی لحاظ سے باقاعدگی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ مثال کے طور پر ایک ایسی شخصیت کا نام لیا جاتا ہے جو علمی اور سیاسی ہر دو اعتبار سے اپنے زمانے کی مدبّر ہستیوں میں شمار ہوتی تھی، ہماری مراد سید رجب علی ارسطو جاہ سے ہے۔ سید رجب علی انگریزوں کی عملداری میں میر منشی تھے۔ پنجاب پر قبضے سے پہلے لاہور دربار سے انگریزی خط و کتابت اکثر انہی کے ذریعے ہوتی تھی۔ فقیر سید عزیز الدین کے سیاسی روزنامچوں میں جو سنٹرل میوزیم لاہور میں محفوظ ہیں، سید رجب علی کی خط و کتابت موجود ہے۔ سید صاحب، سرکاری خط یا جواب فارسی میں لیکن فقیر صاحب کے نام نجی خط عربی میں لکھتے تھے۔ اس کے باوجود ان کی اردو نثر پنجاب کی اردو کا ایک خوبصورت ادبی شاہکار ہے۔ اس جگہ ارسطو جاہ کی اس خود نوشت سوانح عمری سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے، جو انہوں نے تحقیقات چشتی کی تصنیف پر مولوی نور احمد چشتی (مصنف) کو ارسال کی تھی۔ یہ سوانح عمری "باغیچہ مولوی سید رجب علی" کے کوائف کے تحت تحقیقات چشتی میں بعینہٖ نقل کر دی گئی ہے۔ اس نثر میں وہ تمام ادبی خوبیاں موجود ہیں، جنہیں نقادوں نے سرسید اور ان کے رفقاء کی نثر کا طرۂ امتیاز قرار دیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"حال راقم کا یہ ہے کہ ۱۸۰۶ء سمت ۱۸۶۳ بکرما جیت بمقام تلونڈی اپنی جاگیر میں تولد ہوا۔ سمت ۱۸۶۴، ۱۸۰۷ء میں دیوان محکم چند افسر فوج مہاراجہ رنجیت سنگھ نے تلونڈی کو مع دیہات بے سبب بلا وجہ ضبط کر کے ہمارے بزرگوں کو جلا وطن کر دیا۔ وہاں سے نکل کر

جگراؤں میں آئے ۔ سردار فتح سنگھ بہادر اہلو والیہ نے محض عالی جاہی سے دو حویلیاں لائق واسطے اقامت کے جگراؤں میں عطا کیے اور پھر راجہ نہال سنگھ ان کے فرزند نے کچھ زمین باغ کے لیے بخش دی اور ہمیشہ مہربانی کرتے رہے ۔ پھر راقم واسطے تحصیل علوم کے بعمر دروازہ سالگی لاہور کو گیا اور علوم طبیہ کو سید خیر شاہ لاہوری تلمیذ حکیم اعلیٰ سے حاصل کیا اور کتب امامیہ کو ملا مہدی خطائی تلمیذ جناب ملا محمد مقیم صاحب کہ تلامیذ جناب شیخ حر عاملی علیہ الرحمۃ سے کہ علمائے اعلام شیعہ سے ہیں ، پڑھا ۔ تھوڑی صرف ونحو بھی حاصل کی[۴]" ۔

سید رجب علی ارسطو جاہ کی اردو نثر ادبی اسلوب کے نقطۂ نظر سے قابلِ توجہ ہے ۔ جملے سلیس ، عام فہم ، مختصر اور خطِ مستقیم میں آگے بڑھتے ہیں ۔ مفہوم میں کسی قسم کا الجھاؤ یا پیچیدگی نہیں ۔ بیان میں تصنع یا تکلف نہیں ۔ یہی اسلوب انیسویں صدی کے نصف اول میں پنجاب کے ہر مصنف کے ہاں ملتا ہے ۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ سید رجب علی بنیادی طور پر عربی اور فارسی کے انشا پرداز ہیں ، دوسرے ادیب جن کے ہاں اردو بنیادی حیثیت رکھتی ہے اسلوبِ نثر کی اور زیادہ خوبیاں پیش کرتے ہیں ، مثلاً تحقیقاتِ چشتی ، اردو کے نثری ادب میں ایک زندہ جاوید شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے ۔

پنجاب کی تسخیر یعنی ۱۸۴۶ اور مخصوصاً الحاق پنجاب یعنی ۱۸۴۹ کے بعد

---

۴ - تحقیقاتِ چشتی ، لاہور ، ۱۹۶۴ ، ص ۷۱۸ ۔

انگریزوں کی سیاست کا رُخ پنجاب کی طرف ہو گیا۔ وہ دہلی کی مرکزیت کو ختم کر کے پنجاب کو ملکی سیاست اور تہذیب کا اہم مرکز بنانا چاہتے تھے۔ یہ وہ موقع تھا جبکہ سکھ استعمار کے ہاتھوں مجبور اہلِ پنجاب کو اپنی ادبی اور فکری صلاحیتوں کو بروکار لانے کا موقع ملا۔ اہلِ پنجاب نے ہندوستان میں فارسی ادب کی ترویج و ترقی میں استعداد کے جو جوہر دکھلائے تھے، ان سے ہندوستان میں فارسی ادب کی تاریخ غافل ہیں، لیکن انیسویں صدی کے وسط میں اِدھر قومی ضروریات نے اُردو کی اہمیت کو تسلیم کیا اور اُدھر اہلِ پنجاب اپنے ہندوستانی اہلِ قلم دوستوں کے شانہ لبشانہ میدان شعر و ادب میں گوے سبقت لے جانے میں کوشاں ہوئے۔ یاد رہے کہ انیسویں صدی میں ملک پنجاب اور ملک ہندوستان دو جداگانہ سیاسی سرحدوں کا نام تھا، جن میں لبعض تہذیبی خصوصیات کی بنا پر آپس میں رقابت کے مبہم جذبات بھی موجود تھے۔

۱۸۴۹ء کے لعبد نئی گورنمنٹ کا فارسی کی بجائے اُردو کی طرف جھکاؤ، اور اس سے پہلے ۱۸۳۵ء میں پریس کی آزادی کے لائحہ عمل نے پنجاب میں اردو صحافت کو فروغ دیا۔ اخبار یا مجلّے کی شخصیت میں ادارت، مقالہ نگار اور قاری تینوں اہم اور لازم و ملزوم جز ہوتے ہیں۔ پنجاب میں اردو صحافت کے رواج نے اہلِ پنجاب کی اردو کاوشوں کو فروغ دیا۔ ایک طرف خبروں اور وقائع کے ذریعے خارجی شعور وسیع ہُوا تو دوسری طرف اہلِ پنجاب کے قلم اُردو نثر میں پختگی، روانی اور اسلوب کے تنوع پیدا کرنے میں مستعد ہوئے۔ لدھیانہ میں مشنریوں کے چھاپہ خانے سے والبتہ اہلِ قلم نے مذہبی اختلاف انگریزوں کے باوجود اُردو نثر کے اچھے نمونے بھی پیش کئے۔ ۱۸۵۸ء میں منشی محمد عظیم کا

مطبع لاہور کرانیکل، لاہور میں قائم ہوا۔ ۱۸۵۰ء میں لالہ ہرسکھ رائے نے لاہور میں مطبع کوہ نور جاری کیا، اِن مطبعوں نے اخبار شائع کیے۔ جن میں "کوہ نور" کا اردو اخبار ہونے کی حیثیت سے اہلِ پنجاب نے شاندار استقبال کیا۔ کوہ نور کے بعد لاہور سے دریائے نور جاری ہوا جس کے مالک پنجاب کے مشہور علمی و ادبی گھرانے کے فرد فقیر سید سراج الدین تھے۔ لاہور میں فقیر خاندان کی ادبی خدمات محتاجِ تعارف نہیں۔ اس پر مفصل بحث گزشتہ ابواب میں موجود ہے۔
۱۸۵۲ء میں ملتان سے "ریاض نور" مفتی محمد مہدی حسین خاں کی ادارت میں جاری ہوا۔ ۱۸۵۳ء کی گورنمنٹ رپورٹ میں اس اخبار کی زبان کے بارے میں لکھا ہے: "اخبار کی زبان شستہ اردو ہوتی ہے، اور اس کا طرزِ تحریر بہت اچھا ہے[5]"۔
پنجاب کے نوتاسیس مطبعے اخبارات کے علاوہ اردو میں کتابیں بھی شائع کرتے تھے۔ مطبع کوہ نور نے ۱۸۵۰ء میں دس کتابیں، ۱۸۵۱ء میں بارہ کتابیں، ۱۸۵۲ء میں سولہ کتابیں اور ۱۸۵۳ء میں بھی سولہ کتابیں شائع کیں۔ جن کا موضوع مذہب، تاریخ، زراعت، تقویم، قانون اور سائنس تھا۔ ان مطبوعات کی زبان سنسکرت، فارسی اور اردو تھی۔ اردو کتابوں میں تحفۂ کشمیر (مصنف نامعلوم) رسالہ کیمیا مولفہ منشی شیام لال انبالوی، مسودہ قانون مال پنجاب اور پنجاب میں چائے کی کاشت سے متعلق ایک رسالہ شامل ہیں ان کتابوں کی زیادہ سے زیادہ تعدادِ اشاعت ایک ہزار پانچسو اور کم از کم ایک "دو" تھی[6]۔ اسی طرح مطبع نورِ علی نور،

۵۔ محمد عتیق صدیقی: صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات ۱۸۴۸ تا ۱۸۵۳۔ ص ۱۳۱۔
انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۶۲ء عتیق صاحب نے پنجاب کے اخبارات اور ان کے مدیران پر جو حواشی اس کتاب میں تحریر کیے ہیں۔ تقریباً ناقص ہیں۔ مثلاً ص ۱۲۹ پر دریائے نور کا ذکر کرتے ہوئے رپورٹ کے مرتب پر اعتراض کیا ہے کہ اس نے کلمہ فقیر کو سید سراج الدین کے نام کا حصہ بنا دیا ہے حالانکہ حقیقت یہی ہے۔ فقیر، سید سراج الدین کا خاندانی نام ہے۔
۶۔ ایضاً۔ ص ۲۱۴ تا ۲۱۶۔

لدھیانہ۔ مطبع باغ نور، امرتسر۔ مطبع دریائے نور، لاہور۔ مطبع ریاض نور، ملتان۔ مطبع چشمۂ فیض، سیالکوٹ۔ مطبع شعاع شمس، ملتان اور مطبع لاہور گزٹ، لاہور سے اخبارات کے علاوہ اردو و دیگر مشرقی زبانوں میں مطبوعات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس کی تفصیل محمد عتیق صدیقی کی کتاب "صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے خاتمے پر جب دہلی کی مرکزیت کو زوال آیا تو مسلمانوں کی ملّی جہد للبقا کا سب سے اہم مرکز پنجاب تھا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی پنجاب کے اخبار نویس اور صحافی حق گوئی اور نبرد آزمائی میں پیش پیش تھے۔ چنانچہ "ریاض نور" کے مدیر منشی مہدی علی خاں، جنہیں حکومت کی رپورٹ متعلقہ ۱۸۵۳ میں "اول درجے کا ادیب" لکھا گیا ہے۔ ۱۸۵۲ میں ایک تحصیلدار کے خلاف حق گوئی کے الزام میں دو ماہ کے لئے قید کر دیے گئے تھے، ۱۸۵۷ء کے بعد انہی مجاہد اور سینہ سپر ادیبوں نے پنجاب کے ادبی ماحول کو از سرِ نو منظم کرنا شروع کیا۔ ان میں سے صرف منشی ھرسکھ رائے تھے جو حکومت وقت کے ہم آواز اور حلقۂ اعتماد میں تھے۔ دوسرے تمام صحافی اپنی روش اور رائے میں کسی قسم کی پابندی کو پسند نہ کرتے تھے۔ کوہ نور بھی ھرچند حکومت کے ساتھ تھا۔ تاہم منشی ہرسکھ رائے کا مشرقی ضمیر اور اہل پنجاب سے ہم آہنگ احساس کبھی کبھی حکومت پر کڑی نکتہ چینی سے باز نہیں رہتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۱ء کے شماروں میں ہی پلٹن کے گوروں اور انگریز آوارہ گرد جوانوں کی نسبت جو لاہور اور امرتسر کے شرفا کے درمیان غنڈہ گردی کو رواج دے رہے تھے، نہایت نفرت آمیز الفاظ میں حکومت کو متوجہ کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منشی ہرسکھ رائے بھی حکومت کے بارے میں

حق گوئی کے معاملے میں بالآخر پنجاب کے دوسرے اخبار نویسوں کی صف میں شامل ہو گئے تھے حتیٰ کہ ۱۸۷۴ء میں انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ کوہِ نور کو ترک کر دیں تاکہ حق گوئی میں منصب صحافت کا پاس رکھ سکیں۔ گارساں دتاسی ۱۸۷۴ء کے مقالے میں لکھتے ہیں:

"کوہِ نور (لاہور) کے ایڈیٹر نے ارادہ کیا ہے کہ اس اخبار کو چھوڑ کر کوئی اور جریدہ نکالیں جو حکومت کے اثر سے آزاد ہو تاکہ وہ بلا تکلف حکومت پر بھی تبصرہ کر سکیں۔"[7]

انیسویں صدی کا نصف آخر جس طرح پہلے عرض کیا گیا، پنجاب میں مسلمانوں کی جہد للبقا کا دور ہے۔ یہ جہد للبقا انفعالی نہیں اور نہ ہی اس میں بعض تحریکوں کی طرح معذرت خواہی کا عنصر ہے۔ بلکہ حق طلبی کی یہ جنگ آبرومندانہ اور مردانہ حیثیت رکھتی ہے۔ البتہ اس میں محض جذبات کی رو میں بہہ کر اندھا دھند باغیانہ طرزِ اظہار کا عنصر بھی بہت کم تھا۔

۱۸۴۹ء میں عدالتوں کیلئے زبان کے انتخاب پر کمشنروں کی رائے معلوم کی گئی تو اکثر نے اردو اور فارسی کو لازمی قرار دیا۔ اردو کے حق میں آراء زیادہ تھیں لہٰذا پنجاب کے دو ایک ڈویژنوں کو چھوڑ کر جہاں فارسی کا عمل دخل لوگوں کی عادت بن چکا تھا، مثلاً (پشاور اور ڈیرہ جات وغیرہ) تمام پنجاب میں اردو کو پہلے رسمی اور پھر ورنیکلر زبان کے طور پر قبول کر لیا گیا[8]۔ ۱۸۵۶ء کے قریب پنجاب میں اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا مطالبہ زوروں پر تھا۔ چنانچہ کوہِ نور لاہور اپنی ۱۸ اپریل ۱۸۵۶ء کی اشاعت میں

۷۔ مقالات گارساں دتاسی (حصہ دوم) ص ۷۳۔

8. The devolpment of urdu as official language in Punjab, Lahore Goverment press.

لکھتا ہے:

"حتی الامکان اپنی زبان میں اگر تعلیم عام ہووے تو دوسری زبان کی نسبت جلد حاصل ہوتی ہے۔ خیال کیجئے کہ اگر اردو میں سب علوم کی کتابیں بن جاویں تو وہی علوم جلدتر عوام کو حاصل ہوں گے، عربی، فارسی، خواہ سنسکرت والوں کو اس قدر جلد حاصل ہوں گے۔ کیا معنی؟ پہلے تو زبان ہے، سیکھتے سیکھتے اون کے چھ سات برس گزر جائیں گے۔ غرض اس بارہ میں صواب آرائے ہتیمم کوہ نور بہت درست ہے۔ بلکہ جیسے انگریزوں نے زبان عربی یونانی و سنسکرت سے اپنی بھاکہ میں سب علوم ترجمہ کر ڈالے ویسے ہی اردو و فارسی و انگریزی و سنسکرتی والوں کو چاہیے کہ ہر علوم کو ھر ایک زبان سے لیکر اردو میں ترجمہ کیا کریں[9]"

۱۸۵۷ء کے بعد پنجاب اردو صحافت اور اردو ادب کا اہم ترین مرکز قرار پایا۔ گارساں دتاسی نے اپنے خطبات اور مقالات میں اس کی تفصیلات بیان کی ہیں اور گذشتہ ابواب میں بھی اس موضوع پر خاصی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس جگہ اختصار سے صرف اس قدر عرض کرنا کافی ہے کہ پنجاب کو اس دور میں ادبی اعتبار سے بلاشبہ ہندوستان بھر میں عروس البلاد کا رتبہ حاصل تھا۔ پنجاب سے شائع ہونے والے اردو اخباروں کی تعداد ہندوستان کے باقی صوبوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ نمونے کے طور پر ۱۸۷۶ء سے ۱۸۹۹ء تک پنجاب سے شائع ہونے والے اخباروں کی ایک منتخب فہرست ملاحظہ فرمائیے:

البرٹ گزٹ   لاہور   ہفتہ وار   مطبع البرٹ گزٹ   ۱۸۷۶ء   مالک خواجہ احمد حسن

۹۔ منشی ہرسکھ رائے: کوہ نور، ہفتہ وار، لاہور، ۱۸ اپریل ۱۸۵۶ء

گنجینۂ نسطائر	مالک: منشی ہرسکھ رائے	لاہور	ماہنامہ	مطبع کوہ نور	۱۸۷۶ء
اخباروں کا قبلہ گاہ	ایڈیٹر: مولوی نہال چند	"	ہفتہ وار		"
خورشید عالم	مالک: منشی جگن ناتھ	"	"		۱۸۷۷ء
اتالیق زمینداران	مالک: لالہ نرائن داس	ہوشیارپور	پندرہ روزہ		"
دھرم پرکاش	مہتمم: منشی برج لال	گوجرانوالہ	ماہنامہ		"
کلید امتحان	مہتمم: منشی محبوب عالم	"	"		"
اشاعت السنہ	مہتمم: مولوی ابوسعید محمد حسین	لاہور	"		۱۸۷۸ء
سفیر ہند	مالک: پادری رجب علی	امرتسر	ہفتہ وار		"
مجلس اخلاقیہ	مہتمم: مولوی شاہ ولایت	"	عشرہ وار		"
حافظ صحت	ایڈیٹر و بانی: زبدۃ الحکماء حکیم نبی صاحب	لاہور	ماہنامہ		"
خضر ہند	مالک منشی دیوان چند	سیالکوٹ	"		۱۸۷۹ء
آئینہ آئین ہند	مہتمم: منشی برج لال	گوجرانوالہ	"		"
سبھا کپورتھلہ	ایڈیٹر: منشی برکت علی شوکت	کپورتھلہ	ہفتہ وار		"
وکٹوریہ پیپر	ایڈیٹر: برج لال	سیالکوٹ	روزنامہ		۱۸۸۰ء
نسطائر قانون ہند	مالک: رائے ہرسکھ	لاہور	ماہنامہ		"
تکمیل الحکمت	ایڈیٹر: ڈاکٹر سید اکبر شاہ	"	"		"
خزینۃ القوانین	مالک: سید نادر علی شاہ سیفی	"	پندرہ روزہ		"
دہلی پنچ	ایڈیٹر: مولوی فضل الدین	"	ہفتہ وار		"
آفتاب ہند	بانی: منشی برکت علی شوکت	جالندھر	"		۱۸۸۱ء

رفارمر	ایڈیٹر: پنڈت ہرگوپال	لاہور	ہفتہ وار	۱۸۸۲ء
سوانحعمری	مہتمم: منشی نتھورام آمند	〃	ماہنامہ	〃
آئینہ ہند	مالک: لالہ رنگی رام مختار	〃	〃	۱۸۸۳ء
کاسید قوانین	بانی: لالہ رنگی رام	〃	〃	〃
دھرم جیون	ایڈیٹر: پرکھ بادی ستیہ نندا گن ہوتری	〃	پندرہ روزہ	〃
گلدستۂ انجمن	ایڈیٹر: مولوی سیف الحق ادیب	〃	ماہنامہ	〃
دلش الیکٹرک	مالک: رائے سالک رام	〃	ہفتہ وار	〃
رفیق ہند	ایڈیٹر: مولوی محرم علی چشتی	〃	〃	۱۸۸۴ء
مہذب	ایڈیٹر: حکیم جعفر علی بیمار	کپورتھلہ	پندرہ روزہ	〃
رسالہ انجمن رفاہ عام	ایڈیٹر: مرزا عبداللہ	لدھیانہ	ماہنامہ	〃
راوی بے نظیر	ایڈیٹر: پنڈت شیو ناتھ	لاہور	〃	〃
ہدایت	ایڈیٹر: مولوی غلام علی قصوری	〃	ہفتہ وار	〃
خالصہ پنجاب	ایڈیٹر: بھائی فتح سنگھ	مُلتان	〃	〃
طب حیوانات	ایڈیٹر: ڈاکٹر محمد دین	لاہور	ماہنامہ	〃
خیر خواہ کشمیر	مالک: پنڈت سالگ رام کول	〃	ہفتہ وار	〃
شام وصال	مہتمم: مولوی سیف الحق ادیب	〃	روزانہ	〃
نسیم صبح	ایڈیٹر: منشی سیف الحق ادیب	〃	〃	〃
معلم ہند	بانی: محمد حسن احسن کلانوری	〃	ماہنامہ	〃
پنجاب لوکل سلف	مالک: مرزا انور علی	گوجرانوالہ	〃	〃

آئینہ اخلاق	ایڈیٹر : عبدالعزیز	لاہور	ہفتہ وار	۱۸۸۴ء
شفیق ہند	مہتمم : مولوی سیف الحق ادیب	″	″	″
وزیر ہند	مالک : مرزا موحد جالندھری	سیالکوٹ	″	″
رسالہ انجمن حمایت اسلام	مہتمم : مولوی کریم بخش	لاہور	ماہنامہ	″
سفیر پنجاب	مالک : سندھی خاں صفی	ہوشیارپور	ہفتہ وار	″
سراج الاخبار	ایڈیٹر : مولوی فقیر محمد خاں	جہلم	″	۱۸۸۵ء
غمخوار ہند	مہتمم : علیم الدین	لاہور	″	″
طبیب لاہور	ایڈیٹر : حافظ فخرالدین	″	ماہنامہ	″
آفتاب عالمتاب	ایڈیٹر : منشی رام سنگھ	″	ہفتہ وار	″
لاہور گزٹ	مالک : منشی دیدار بخش	″	″	″
ہردلعزیز	ایڈیٹر : رام سنگھ	″	″	″
خیرخواہ عام	مالک : منشی رلارام	گجرات	″	″
ناظم الہند	مالک : سید ناظر حسین ناظم	لاہور	″	″
اشاعت اسلام	بانی : محمد امین	راولپنڈی	ماہنامہ	″
کلید جنت	مالک : سردار علی اختر	لاہور	″	″
گلدستہ حکمت	مالک : حکیم احمد الدین	″	″	″
شیخ چلی	مالک : بال سنگھ اہلوالیہ	سیالکوٹ	ہفتہ وار	″
رہبر ہند	مالک : سید نادر علی شاہ متقی	لاہور	ہفتہ میں دوبار	″
آئینہ سخن	ایڈیٹر : عبدالحلیم نادم	انبالہ	ماہنامہ	″
دانش ہند	مالک : پنڈت راج ناتھ اور محمد دین	ملتان	ہفتہ وار	۱۸۸۶ء

پنجاب ریویو	ایڈیٹر: پادری رجب علی	امرتسر	ماہنامہ	۱۸۸۷ء
ہمت	مہتمم: منشی محبوب عالم	گوجرانوالہ	ہفتہ وار	״
فیض عام	مالک: منشی گنڈا رام	امرتسر	״	״
جعفر زٹلی	مالک: مُلا محمد بخش	لاہور	״	״
روشنی	مالک: شیر محمد	״	״	״
ہادی	مہتمم: پنڈت ہرگوپال بی۔ ایچ۔ جی دتاتریہ	״	״	״
پبلک نیوز	״ ״ ״	״	״	״
شریر	مہتمم: اتم چند کپور	״	پندرہ روزہ	״
نغمہ ہند	ایڈیٹر: یوسف علیخاں قزلباش	״	ہفتہ وار	״
مناد	ایڈیٹر: منشی محبوب عالم	فیروزوالا	״	״
مُشیر ہند	مالک: شرف الدین شرف	لدھیانہ	״	״
انبالہ گزٹ	مالک: لالہ ہربنس رائے	انبالہ	״	״
پیسہ اخبار	مالک: منشی محبوب عالم	گوجرانوالہ	״	״
امرتسر گزٹ	مالک: نیاز علی خاں	امرتسر	״	۱۸۸۸ء
سرمور گزٹ	مالک: منشی سراج الدین	انبالہ	״	״
رسالہ مدرسہ علوم اسلامیہ	ایڈیٹر: منشی تاج الدین	لاہور	ماہنامہ	״
پنجاب	ایڈیٹر: مولوی غلام محمد اختر کلانوری	امرتسر	ہفتہ وار	۱۸۸۹ء
پنجاب گزٹ	ایڈیٹر: منشی غلام قادر فصیح	سیالکوٹ	״	״
خیر اندیش	ایڈیٹر: پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی	انبالہ	״	״

ریاض ہند	مالک: محمد حسین	امرتسر	ہفتہ وار	۱۸۸۶ء
زمیندار	مہتمم: منشی محبوب عالم	گوجرانوالہ	ماہانہ	״
طوفان	مالک: بھان سنگھ آہلووالیہ	سیالکوٹ	ہفتہ وار	״
ملّا دو پیازہ	ایڈیٹر: میاں علاؤالدین	لاہور	״	״
ملکی نامہ بر	ایڈیٹر: سید جواد علی شاہ	״	״	״
ملکی شہیدا	مالک: مولوی فضل الدین	״	״	״
وزیر الملک	مالک: مرزا غلام احمد	سیالکوٹ	پندرہ روزہ	״
پاٹے خاں	مالک: منشی عبدالرحمٰن	لاہور	ہفتہ وار	״
تیس مار خاں	مالک: سردار علی صاحب اختر	״	״	״
معاون مجمع محمدی	ایڈیٹر: شیخ ریاض الدین احمد بریلوی	کراچی	״	״
ینو گائیڈ	مالک: ماسٹر غلام حسین	لاہور	״	״
امپیریل پیپر	مالک: سید رجب علی شاہ	״	״	״
بسر بر	مالک: منشی گیان چند	سیالکوٹ	״	״
مجمع علوم والفنون	ایڈیٹر: مولوی عبداللہ خاں	لاہور	ماہانہ	״
پنجاب اوپینین	مالک: لالہ مالک رام شاد	ہوشیار پور	ہفتہ وار	״
خالصہ گزٹ	بانی: بھائی نند گوپال	لاہور	״	״
ترجمان حقیقت	مہتمم: ولی اللہ	قصور	״	״
فیروز پور پنچ	مالک: فیروز الدین	فیروز پور	״	״
معائنہ	ایڈیٹر: سید جواد علی	لاہور	״	״
باغبان	ایڈیٹر: بابو عزیز الدین	״	ماہانہ	״

۱۸۹۱ء	ہفتہ وار	لاہور	مالک: لالہ ہیرا لال کپور	پنجاب سماچار
″	″	سیالکوٹ	ایڈیٹر: بابو راج اندر سنگھ	رائل خالصہ گزٹ
۱۸۹۲ء	″	راولپنڈی	ایڈیٹر: کرپا رام	ہمالہ
۱۸۹۳ء	″	لدھیانہ	مہتمم: مولوی نور محمد اور شیخ الہ دین	نور علیٰ نور
″	ماہانہ	سیالکوٹ		محمڈن نیشنل میگزین
۱۸۹۴ء	ہفتہ وار	راولپنڈی	ایڈیٹر: منشی غلام نقش بند سندھی خان صفی	المسلم
″	″	لاہور	بانی: لالہ تولا رام و بخشی تارا چند چھبر	انصاف پسند
″	″	راولپنڈی	ایڈیٹر: منشی غلام نقش بند سندھی صفی	سرحدی اخبار
۱۸۹۵ء	ماہانہ	لدھیانہ	مالک: الہ بخش و مولا بخش	گلدستہ سخن
″	ہفتہ وار	امرتسر	مہتمم: شیخ غلام محمد	وکیل
″	″	لاہور	ایڈیٹر: ڈاکٹر غلام نبی	زبدہ اخبار
″	″	امرتسر	ایڈیٹر: نرائن سنگھ اہلوالیہ	جہاں نما
″	″	راولپنڈی	مالک: منشی امیر علی	چودھویں صدی
″	″	وزیرآباد	مالک: دیوان آتما	پنجاب آرگن
″	ماہانہ	لاہور	مالک: مولوی محبوب عالم	انتخاب لاجواب
۱۸۹۶ء	ہفتہ وار	ہوشیارپور	ایڈیٹر: پنڈت ہری لال شرما	دوآبہ

تہذیب نسواں ایڈیٹر شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی لاہور ہفتہ وار ۱۸۹۸ء

آریہ مسافر مہتمم : مہاشے وزیر چند جالندھر " ۱۸۹۹ء

۱۸۷۶ء سے پہلے کے اخباروں میں ہمائے پنجاب، لاہور (۱۸۷۰ء) اخبار انجمن پنجاب، لاہور (۱۸۷۱ء) فیض عالم، سیالکوٹ (۱۸۷۱ء) ریاض نور، ملتان (۱۸۵۲ء) اور رسالہ انجمن قصور قابلِ ذکر ہیں۹۔

رفیق ہند کی اشاعت سے پنجاب میں مسلمانوں کی قومی صحافت کا نیا باب شروع ہوا۔ اس کے زیرِ اثر قومی موضوعات نے ادب میں راہ پائی۔ رفیق ہند نے اہلِ پنجاب کے سیاسی شعور کی تربیت اور نشو و نما میں اہم کردار ادا کیا۔ حکومت اور عمال حکومت پر انتقاد نے اہلِ پنجاب کی سیاسی بصیرت کو وسعت دی۔ رفیق ہند اور اس کے ہم عصر دوسرے اخباروں نے نہ صرف آزادی صحافت کیلئے کوشش کی جو پنجاب میں صحت مند روایت کی حیثیت اختیار کر گئی۔ بلکہ قومی اور فکری آزادی کیلئے بھی ہمیشہ صدا بلند کی اور ملک میں حاکم و محکوم کے درمیان امتیاز اور تفریق مٹانے کیلئے مجاہدانہ کوششیں انجام دیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں پنجاب میں محکمہ تعلیم، پنجاب بکڈپو اور پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ان اداروں کی محنت سے اردو زبان میں درسی کتابوں کی اچھی خاصی مقدار فراہم ہو گئی۔ انجمن مطالب مفیدہ پنجاب (انجمن پنجاب) کے ارکان نے اس سلسلے میں محکمہ تعلیم کی پوری پوری مدد کی۔ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی

۹۔ تفصیل کیلئے دیکھئے تاریخ صحافت اردو از امداد صابری، صحافت پاکستان و ہند میں۔ از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔ اردو صحافت از بدر شکیب اور اختر شہنشاہی تصنیف سید محمد اشرف نقوی۔

نے آٹھ سب کمیٹیاں مقرر کیں تاکہ ہر کمیٹی اپنے اپنے مضمون کے علمی، ادبی اور تحقیقی معیار کو بلند سے بلند تر کرنے کی کوشش کرے

ان سب کمیٹیوں کی تفصیل مندرجہ ذیل تھی :

۱ - انگریزی زبان و ادب اور گرامر کی سب کمیٹی ۔

۲ - حساب سائنس اور فنی تعلیم کی سب کمیٹی ۔

۳ - تاریخ و جغرافیہ کی سب کمیٹی ۔

۴ - اردو زبان، ادب اور گرامر کی سب کمیٹی ۔

۵ - ہندی اور سنسکرت کی سب کمیٹی

۶ - عربی اور فارسی کی سب کمیٹی ۔

۷ - گورمکھی کی سب کمیٹی ۔

۸ - سکول لائبریریوں اور حوالہ جات لائبریریوں کی سب کمیٹی"۔

محکمۂ تعلیم کے افسروں میں سے آرنلڈ، میجر فلر، کرنل ہالرائیڈ اور ڈاکٹر لائٹنر کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں ۔

۱۸۶۹ء میں پنجاب یونیورسٹی کالج اور ۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا ۔ پنجاب یونیورسٹی دراصل انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب المعروف انجمن پنجاب کی تعلیمی مساعی کا نتیجہ تھی ۔ درسی کتابوں کی تصنیف و تالیف میں محکمہ تعلیم اور پنجاب یونیورسٹی کے پروگرام ایک ہی مقصد اور مطمع نظر کے حامل تھے ۔ محکمہ تعلیم اور انجمن پنجاب کی طرف سے جو بے شمار درسی کتابیں شائع ہوئیں ان میں مندرجہ ذیل کتابیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔

---

۱۱ - رپورٹ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی ۱۸۹۷، ۱۸۹۶ء ص ۵ ۔

۱۔ تشبیر ظہوری، شرح اردو نثر اول ظہوری : تصنیف مولوی کریم الدین

حسب الحکم کپتان فلر مطبع سرکاری لاہور ۱۸۶۱ء

۲۔ منتخبات ابوالفضل (اردو ترجمہ) : منشی قمرالدین خاں۔

مطبع کوہ نور لاہور ۱۸۶۱ء

۳۔ منتخبات بوستان مع اردو ترجمہ : منشی قمرالدین خاں۔

حسب الحکم کپتان فلر، مطبع سرکاری لاہور ۱۸۶۳ء

۴۔ جبر و مقابلہ (مصنف نامعلوم)

حسب الحکم کپتان ہالرائیڈ، مطبع سرکاری لاہور ۱۸۶۹ء

۵۔ تاریخ عالم (مصنف نامعلوم)

حسب الحکم کپتان ہالرائیڈ، مطبع سرکاری لاہور ۱۸۷۱ء

۶۔ قصہ سورج پور : منشی چرونجی لال

بہدایت ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم ممالک مغربی، گورنمنٹ پریس الہ آباد ۱۸۷۱ء

۷۔ عربی زبان کے امتحان کا نصاب مع ترجمہ زبان اردو

حسب الحکم کپتان ہالرائیڈ، مطبع سرکاری لاہور ۱۸۷۲ء

۸۔ مرآۃ الاشکال : مرتبہ و محلّٰہ عبدالعزیز متعلم نورمل سکول لاہور۔

مطبع محمدی لاہور ۱۸۷۵ء

۹۔ جوہر عقل : منشی عزیز الدین :

مطبع پنجابی لاہور ۱۸۶۴ء

۱۰۔ سنین الاسلام : ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو لائٹنر

مطبع انجمن پنجاب لاہور (حصہ اول ۱۸۷۱ء) حصہ دوم ۱۸۷۶ء

۱۱ - روضۃ الادباد : مولوی محمد الدین۔

مطبع انجمن پنجاب لاہور فروری ۱۸۷۹ء

۱۲ - فیضیہ : مولوی فیض الحسن۔

بحکم ڈاکٹر جی ڈبلیو لیٹنر، مطبع انجمن پنجاب لاہور ۱۸۸۲ء

۱۳ - رسالہ منطق استقرائی : مولوی (پیرزادہ) محمد حسین۔

مطبع انجمن پنجاب لاہور ۱۸۸۲ء

۱۴ - مبادی علم جیولوجی : اردو ترجمہ از مولوی الطاف حسین حالی پانی پتی۔

مطبع انجمن پنجاب لاہور ۱۸۸۳ء

درسی کتابوں کے ذکر میں مولانا آزاد کی ریڈروں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نصابی اور درسی ادب کی زندہ یادگاریں ہیں۔ ان کتابوں پر مفصل بحث آزاد کے سوانحی مآخذ میں موجود ہے۔ بالخصوص ڈاکٹر اسلم فرخی نے اردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب پر سیر حاصل بحث کی ہے[12]۔ ان کتابوں کے ذریعے آزاد نے پنجاب کے بچوں کی فکری اور لسانی نشوونما میں اہم خدمت انجام دی ہے۔

انیسویں صدی کا سب سے اہم ادبی واقعہ انجمن مطالب مفیدہ پنجاب کا قیام تھا۔ جسکو عرف عام میں انجمن پنجاب کہتے تھے۔ انجمن پنجاب کے قیام اور قابل ذکر کارناموں پر گذشتہ باب میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ یہاں صرف اس قدر عرض کرنا کافی ہوگا کہ انجمن پنجاب نے ادب کی ترقی اور نشوونما کیلئے ایک صحت مند اور سالم ماحول

۱۲- اسلم فرخی : مولوی محمد حسین آزاد جلد دوم کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان ص ۶۳۷۔

مہیا کیا اور ادیبوں کو تخلیقی کام کرنے میں ہر قسم کی امداد دی۔ انہیں فکری آزادی کا احساس دلایا، حکومت اور عوام کی نظروں میں ان کا احترام پیدا کیا اور تصانیف پر عوام اور حکومت کی طرف سے مالی سرپرستی مہیا کر کے انہیں فکر معاش سے بھی آسودہ خاطر کیا۔

انیسویں صدی میں سرسید تین مرتبہ پنجاب میں تشریف لائے۔ ۱۸۷۳ء میں ۱۸۸۴ء میں اور ۱۸۸۸ء میں۔ پہلے سفر کی نامکمل رپورٹ گارساں دتاسی کے مقالات میں ہے، دوسرے اور تیسرے سفر کی مکمل روئداد ہمیں مولوی اقبال علی کے نوشتہ سفرنامے اور رفیق ہند کے فائلوں سے دستیاب ہوتی ہے۔ سرسید کی آمد نے اگر ایک طرف اہل پنجاب کو فکر و عمل کی قوت مہیا کی تو دوسری طرف سرسید بھی اہل پنجاب کے دین دارانہ اور مخلصانہ مشوروں سے متاثر ہوئے، اور اپنے بعض نظریات میں اعتدال پیدا کرنے کی طرف راغب ہوئے۔

اس دور کی دیگر ادبی بحثوں میں ایک بحث اردو ادب میں فحش مطالب کی نشاندہی اور اس کے خلاف ردعمل ہے۔ حکومت نے اصلاحی ادب کی تحریک میں جس کیلئے انجمن پنجاب وجود میں آئی تھی مشرقی ادبیات کے اہم آثار پر اعتراض کرنا شروع کئے۔ یہاں تک کہ کلیات جعفر زٹلی اور دھونکل نامہ کی فروخت پر تو فحش فروشی کے الزام میں مقدمے دائر کر دیئے گئے۔ اس سلسلے میں پنڈت کرشن لال نے انجمن پنجاب کے ایک جلسے میں "مقیاس فحش" کے عنوان سے تقریر کی جو اخبار انجمن پنجاب میں ۲ر فروری ۱۸۷۴ء کی اشاعت میں نقل کی گئی۔ گارساں دتاسی نے "اخبار انجمن پنجاب" اور ہفتہ وار "پنجابی" کے حوالے سے اس بحث کی مفصل روئداد پیش کی ہے۔

گارساں دتاسی کا اپنا خیال ہے کہ "بہتیرے یورپینوں کا تو یہ گمان ہے کہ ہر ایشیائی کتاب فحش ہے۔ اس صورت میں تو جنتری اور بغدادی قاعدے تک پر اعتراض ہو سکتا ہے[۱۳]"۔
پنڈت کرشن لال کی تقریر کے اہم نکات کا خلاصہ ہفتہ وار پنجابی (۲۱ فروری ۱۸۷۴ء) کے حوالے سے گارساں دتاسی نے یوں درج کیا ہے :

"انسان اور حیوان میں اصل فرق زبان کا ہے۔ زبان کے وسیلے سے انسان اپنے خیالات اور احساسات کا اظہار کرتا ہے۔ اظہار کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں یا تو کوئی فحش مضمون برہنہ ہو سکتا ہے یا نیم برہنہ یا پوشیدہ اور یا شائستہ۔ اس لحاظ سے اسلوبِ بیان کی چار الگ الگ قسمیں ہیں :- ۱۔ وہ جس میں کوئی مذموم مضمون انتہائی برہنگی سے بیان کیا جائے۔ ۲۔ وہ جس میں صنائع و بدائع سے اس کا ستر کیا جائے۔ ۳۔ وہ جو آزادی میں حسن کا پہلو باقی رکھے۔ ۴۔ وہ جس میں بات بڑی تراش اور سنوار کے ساتھ کہی جائے[۱۴]!"

پنڈت کرشن لال کا موقف یہ ہے کہ مشرقی ادبیات کا معیاری اور کلاسیکی حصّہ چوتھے پیرائے میں شمار ہوتا ہے۔ جس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ یہ "پیرایہ نہ میٹھا ہے، نہ سلونا۔ یہ قطعاً عالمانہ ہے اور اسے علمی بحثوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے شہوانی یا جنسی معاملات سے فی نفسہٖ کوئی تعلق نہیں"۔ پنڈت موصوف نے سنسکرت کے تمام ادبی شہکاروں کو اس پیرائے میں شامل کیا ہے۔ البتہ فارسی ادب کے بارے میں کہتے ہیں :

۱۳۔ مقالات گارساں دتاسی حصّہ دوم ص ۵۹ ۔
۱۴۔ ایضاً

"فارسی میں زبان کے سبھی پیرائے ملیں گے ۔ خاقانی اور انوری نے فحش بیانی کی ہے ۔ لیکن ایسی ہوشیاری سے کہ ناظر کے ذوق پر گراں نہیں گزرتی ۔ پیرایہ مستور میں تو فارسی نے ایسی ندرت دکھلائی ہے کہ اور کہیں جواب نہیں ملتا ۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ فارسی کے ہر انشا پرداز کے یہاں اس کی مثالیں ملیں گی ۔ اس ضمن میں "بہار دانش" خاص طور پر بدنام ہے ۔ گلستان تک جس کا ورد بچّہ بچّہ کرتا ہے ۔ اس عیب سے خالی نہیں ، اس میں ایسے جملوں اور محاوروں کی کمی نہیں جو مذاق سلیم پر گران گزرتے ہیں[۱۵]"۔

اس سلسلے میں اردو کے بارے میں بھی ان کی رائے سُن لیجیے :

"رہ گئی اردو ، تو اسپر فارسی کا گہرا اثر ہے ۔ اور اسی کی طرح اس نے پردے پردے میں سب کچھ کہہ جانے کا خوب سلیقہ پیدا کر لیا ہے ۔ لیکن برقعہ اُتار کر اوڑھنی ڈال لینے سے عورت کا حُلیہ جتنا بدل جاتا ہے ، اُتنا ہی فرق ریختہ اور ریختی میں ہے ۔ جعفر زٹلّی ، جرکین اور جان صاحب کی تک بندی علانیہ فحش نویسی کی مثالیں ہیں ۔ سودا ، انشا ، رنگین ، نظیر وغیرہ نے ان ہی مضامین پر خاصی لیپا پوتی کی ہے ۔ لیکن اگر انگریزوں کی عینک سے دیکھیے تو ساری ہندوستانی شاعری پر فحش نگاری کا الزام عاید ہو سکتا ہے ۔ جملہ دواوین کے علاوہ نعمت علی خاں کی حُسن و عشق ،

---

۱۵ ۔ مقالات گارساں دتاسی حصّہ دوم ۔ ص ۶۲

پنج رقعہ، مینا بازار اور شبنم شاداب کو کس زمرے میں رکھیئے گا،
غنیمت ہے کہ ان کتابوں کا شمار زٹلی اور جان صاحب کی خرافات کے
ساتھ نہیں ہوتا ۔ ورنہ یہ تو بے انصافی کی انتہا ہو جاتی کہ اگر
ترازو کا پلا اتنا جھکایا گیا تو تخیل کے انتہائی نادر نمونوں پر بھی
احتساب کرنا ہوگا اور ہمارا سارا ادب مردُود قرار دے دیا جائے گا[16]۔"

پنڈت کرشن لال نے انگریزی ادبیات کا جائزہ لیتے ہوئے، اس کے عُریاں
پہلو اور خاص طور پر لارڈ بائرن کی شراب وشباب سے دلچسپی پر اعتراض کرتے
ہوئے حکومت سے مُطالبہ کیا ہے کہ جب ان حضرات کی کتابیں فحش نہیں تو پھر
بھلا اردو و فارسی کے غریب شاعروں نے کیا جُرم کیا ہے ۔ اپنا اپنا پیرایۂ اظہار ہے
ورنہ مضمون تو دونوں کے ایک ہی ہیں"۔

ایک اور بحث جو اس دور کے ادبی محیط پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے،
اُردو میں انگریزی الفاظ کے استعمال کی ہے ۔ ادیبوں کے دو واضح گروپ اس
بحث میں شریک ہیں ۔ پنجاب کی اردو اور فارسی میں انگریزی الفاظ کا استعمال
الحاق پنجاب کے قریب بلکہ اس سے بھی پہلے ہو چکا تھا ۔ اکبری کے سہرے کا ایک
شعر پہلے نقل کیا جا چُکا ہے ۔ اس سلسلے میں کوہ نور لاہور کی اشاعت مورخہ
۲۸ ر جون ۱۸۵۱ء میں محمد حسین خاں افسر اپنے فارسی مکتوب میں انچ اور پریس
مین کے الفاظ بلا تکلف استعمال کر رہے ہیں ۔ " مگر اکنوں برائے اجرائے کار
"پریس مین" مع یک سنگ ساز روانہ فرمائند[17]" ۱۸۸۴ء میں سرسید کی پنجاب میں

---

۱۶ - مقالات گارساں دتاسی حصہ دوم ص ۶۲

۱۷ - صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات ص ۱۸۲

آمد کے بعد یہ موضوع ادبی بحث کا اہم حصہ قرار پایا۔ اس کا سبب شاید یہ تھا کہ سر سید خود اردو میں انگریزی الفاظ کے استعمال کو برا نہیں سمجھتے تھے۔

اس دور کے ادیبوں اور شاعروں نے نہ صرف انگریزی الفاظ کا استعمال کیا بلکہ انگریزی ادب کے پیرائے میں نظمیں لکھتے ہوئے، انگریزی ادب سے پورا پورا استفادہ بھی کیا۔ اس استفادے کی مثالیں خاص طور پر انجمن پنجاب کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعروں سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اس دور میں انگریزی سے اردو میں بکثرت ترجمے ہوئے۔ ترجمے کے اصول پر ڈاکٹر لائٹنر کی مندرجہ ذیل رائے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس دور کے مصنفین نے یقیناً اس مشورے پر عمل کیا ہو گا۔ ڈاکٹر کی یہ رائے گارساں دتاسی نے یوں نقل کی ہے:

"میں ڈاکٹر لائٹنر کی اس رائے سے بالکل متفق ہوں کہ مغربی زبانوں کی تصانیف کا لفظ بہ لفظ ہندوستانی میں ترجمہ کرنے کے بجائے ان کے مطالب کو سلیس زبان میں ادا کرنا چاہیے۔ اس سے یہ فائدہ ہو گا کہ ہندوستانی لوگ ان تصانیف کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔ اور ترجمہ کرنے والوں کو بھی سہولت ہو گی۔"[18]

اس دور کے نثری تراجم میں دیگر مصنفین کے علاوہ مولوی محمد حسین آزاد نے اعلیٰ پائے کے ترجمے اردو ادب کو دیے ہیں۔ ان کے ایک ترجمے کا ذکر مولوی اقبال علی کی کتاب "سر سید احمد خاں کا سفر نامہ پنجاب" میں بھی ہے۔ ۲ر جنوری ۱۸۸۴ء کو قیام لاہور کے دوران میں سر سید نے جو ڈسٹرکٹ کمشنر مسٹر پارکر کی دعوت پر سینیٹ ہال

۱۸- مقالات گارساں دتاسی حصہ اول ص ۷۷

میں ایک جلسے سے خطاب کیا۔ اس جلسے میں مولانا آزاد نے اکسلسئیر کا منظوم اردو ترجمہ سُنایا۔ مولوی اقبال علی لکھتے ہیں :

"اسی جلسے میں مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے اپنے پرانے تصنیف کیے ہوئے اشعار، جو انگریزی پوئٹری "اکسلسئیر" کا ترجمہ تھے اور جن میں ترقی کرنے کی ہمت دلانے کا مضمون ہے، پڑھے جس کا ترجیع بند یہ تھا :

آہستہ سر جھکا کے کہا، ہاں بڑھے چلو

سید صاحب نے مولوی صاحب کے کلام کی تعریف نہایت برجستہ الفاظ میں کی[19]۔"

بیسویں صدی کا آغاز، ادبی صحافت کا زرّیں عہد ہے۔ ہفت روزہ اخباروں کی جگہ ماہنامہ ادبی مجلّوں نے لے لی۔ اور خبروں کیلئے روز ناموں کا رواج ہوا۔ مخزن کے اجراء نے سنجیدہ اور معیاری ادب کو فروغ دیا۔ تنقید اور تحقیق جیسے اہم ادبی موضوعات کو رواج دیا۔ مخزن کو مشرقی اور مغربی افکار کے درمیان ایک رابطہ یا پل قرار دینا چاہیے۔ سر عبدالقادر کا مخزن ایک انجمن تھی جس کے حلقے میں نئے طرز اظہار اور اسالیب جنم لیتے تھے۔ مخزن ہی وہ ادبی محفل تھی جس نے اردو ادب کو اقبال جیسا غیر فانی شاعر دیا۔ اس تربیت گاہ سے جو ادیب اور شاعر برآمد ہوئے، آسمان ادب پر ماہ و خورشید کی صورت درخشاں ہوئے۔

---

۱۹ - مقالات گارساں دتاسی حصہ اول ص ۲۱۱ ۔

سر عبدالقادر کی ادارت کے بعد ہر چند مخزن میں وہ سنگینی نہ رہی۔ پھر بھی مولانا تاجور نجیب آبادی نے بساط شعر کو وسعت اور گسترش دینے میں اہم خدمات انجام دیں۔ سر عبدالقادر کا مخزن غالباً ۱۹۱۰ء میں بند ہو گیا، لیکن جو ادبی روایت اس سے قائم ہوئی وہ مخزن کے آخری دور یعنی ۱۹۵۰ء تک باقی رہی، آخری دور مخزن کی زندگی کا چوتھا مرحلہ تھا۔ یہ دور ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء یعنی فقط دو سال پر مشتمل ہے۔ اس دور میں مخزن کے مدیر مولانا حامد علی خاں تھے۔

مآخذ

ماخذ

مخطوطات

۱- اکبری، امرناتھ : مسودہ دیوان اکبری بخط مصنف (عکسی نقل) کراچی نیشنل میوزیم۔

۲- عزیز الدین، فقیر : روز نامچہ (عکسی نقل) لاہور، میوزیم۔

۳- " " : دیوان آزاد شریف (خطی) لاہور، کتابخانہ فقیر خانہ۔

۴- گوھر نوشاہی : اردو شاعری میں لاہور کا حصہ۔ (تحقیقی مقالہ) لاہور، پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔

۵- منور، فقیر سید نورالدین : دیوان منور، خطی (عکسی نقل) کراچی، نیشنل میوزیم۔

۶- ناظر حسن زیدی : مومن دہلوی (مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی) لاہور، پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔

۷- نور احمد چشتی، مولوی : دیوان چشتی (قلمی) کتابخانہ راقم الحروف۔

۸- یکدل، مولوی احمد بخش چشتی : بیاض یکدل با تفصیل زیر مملوکہ مولانا مسعود علی چشتی و قراۃ العین چشتی۔

۹- بیاض ۱ : ۱۸۲۱ء تا ۱۸۳۳ء

۱۰- بیاض ۲ : ۱۸۳۳ء تا ۱۸۳۵ء

۱۱- بیاض ۳ : ۱۸۳۵ء تا ۱۸۳۷ء

۱۲- بیاض ۴ : ۱۸۳۷ء تا ۱۸۳۸ء

۱۳- بیاض ۵ : ۱۸۳۸ء تا ۱۸۴۰ء

۱۴۔ بیاض ۶ : ۱۸۴۰ء تا ۱۸۴۲ء

۱۵۔ بیاض ۷ : ۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۳ء

۱۶۔ بیاض ۸ : ۱۸۴۳ء تا ۱۸۴۴ء

۱۷۔ بیاض ۹ : ۱۸۴۴ء تا ۱۸۴۵ء

۱۸۔ بیاض ۱۰ : ۱۸۴۵ء تا ۱۸۴۶ء

۱۹۔ بیاض ۱۱ : ۱۸۴۶ء تا ۱۸۴۷ء

۲۰۔ بیاض ۱۲ : ۱۸۴۷ء تا ۱۸۴۸ء

۲۱۔ بیاض ۱۳ : ۱۸۴۸ء تا ۱۸۴۹ء

۲۲۔ بیاض ۱۴ : ۱۸۴۹ء

۲۳۔ بیاض ۱۵ : ۱۸۴۹ء تا ۱۸۵۰ء

۲۴۔ بیاض ۱۶ : ۱۸۵۰ء تا ۱۸۵۱ء

۲۵۔ بیاض ۱۷ : ۱۸۵۲ء

۲۶۔ بیاض ۱۸ : ۱۸۵۳ء تا ۱۸۵۴ء

۲۷۔ بیاض ۱۹ : ۱۸۵۷ء (اولاد نے تلف کردی)

۲۸۔ بیاض ۲۰ : ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۱ء

مطبوعات

۲۹۔ آغا محمد باقر : تاریخ نظم و نثر اردو
لاہور شیخ مبارک اینڈ سنز ۱۹۵۰ء

۳۰۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر : مولوی محمد حسین آزاد
کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۵ء

۳۱ - اعجاز الحق قدوسی : تذکرۂ صوفیائے پنجاب
کراچی، سلمان اکیڈمی، ۱۹۶۲ء

۳۲ - اقبال علی، سید، مولوی : سر سید احمد خاں کا سفر نامہ پنجاب
لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۳ء

۳۳ - اکبر علی، صوفی : سلیم التواریخ
امرتسر، اردو بازار، الیکٹرک پریس، ۱۹۱۹ء

۳۴ - اکبری، امرناتھ : دیوان اکبری
لاہور، کوہ نور ۱۸۷۳ء

۳۵ - " " : ظفر نامہ رنجیت سنگھ، مرتبہ سیتارام کوہلی
لاہور، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۲۸ء

۳۶ - الطاف حسین حالی، مولانا : مجموعۂ نثر حالی، مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی۔
لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۸ء

۳۷ - " " " " : مجموعۂ نظم حالی (دوسرا ایڈیشن)
گرودت ہاؤس۔

۳۸ - امداد صابری، مولانا : آثار رحمت۔
دہلی، یونین پریس (بھارت)

۳۹ - " " " : تاریخ صحافت
دہلی، جدید پرنٹنگ پریس جامع مسجد، بھارت، ۱۹۷۴

۴۰ - " " " : روح صحافت
دہلی، مکتبہ شاہراہ، ۱۹۶۸ء

۴۱ - امداد صابری، مولانا : حیاتِ آشوب
دہلی، یونین پریس جامع مسجد ۱۹۵۶ء

۴۲ - 〃 〃 〃 : فرنگیوں کا جال
دہلی (بھارت) چوڑی والاں

۴۳ - 〃 〃 〃 : ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعراء
دہلی، مکتبہ شاہراہ، ۱۹۵۹ء

۴۴ - امین چند : سفرنامہ امین چند
لاہور، ہوپ پریس، ۱۸۵۹ء

۴۵ - تارا چند : مرقعِ پنجاب
دہلی، امپیریل بک ڈپو پریس ۱۹۱۰ء

۴۶ - حامد حسن قادری : داستان تاریخِ اردو (طبع دوم)
آگرہ لکشمی نرائن اگروال، ۱۹۵۷ء

۴۷ - حنیف شاہد : اقبال اور انجمن حمایتِ اسلام۔
لاہور، انجمن حمایتِ اسلام، ۱۹۷۶ء

۴۸ - دتاتریہ کیفی، پنڈت : منشورات
دہلی، دریا گنج، ۱۹۴۰ء

۴۹ - رام بابو سکسینہ : تاریخِ ادبِ اردو (اردو ترجمہ) مرزا محمد عسکری
لکھنو، رام کمار پریس ۱۹۰۹ء

۵۰ - رشید نیاز : تاریخ سیالکوٹ
سیالکوٹ، مکتبہ نیاز، ۱۹۵۸ء

۵۱ - سری رام، لالہ : خمخانۂ جاوید (جلد اول)
دہلی، مخزن پریس، ۱۹۰۸ء

۵۲ - سرخوش، شیر علی : اعجاز سخن
لاہور، روٹری پرنٹنگ۔

۵۳ - سوہن لعل سوری : عمدۃ التواریخ
لکھنو، نولکشور۔

۵۴ - شجاعت علی سندیلوی : حالی بحیثیت شاعر
لاہور، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۶۰ء

۵۵ - عبد الرشید، مولوی : پنجاب یونیورسٹی، مترجم میر نثار علی شہرت
مطبوعہ (سرورق ندارد)

۵۶ - عبد السلام خورشید، ڈاکٹر : صحافت پاکستان و ہند میں۔
لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء

۵۷ - عبد القدوس : تقویم تاریخی (قاموس تاریخی)
کراچی، مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی، ۱۹۶۵ء

۵۸ - عبد اللہ، ڈاکٹر سید : اردو ادب ۱۸۵۷ سے ۱۹۶۶ تک
لاہور، مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۶۷ء

۵۹ - عبد المالک، مولوی : تاریخ شاہان گوجر
اعظم گڑھ، مطبع معارف ۱۹۳۴ء

۶۰ - علی الدین، مفتی : عبرت نامہ (فارسی)
لاہور، پنجابی اکیڈمی، ۱۹۶۱ء

۶۱ - غالب، میرزا اسداللہ : دیوان غالب، نسخۂ طاہر، مرتبہ گوہر نوشاہی
لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۶۹ء

۶۲ - غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر : اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر
لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۶ء

۶۳ - " " " : تاریخ اورینٹیل کالج
لاہور، جدید اردو ٹائپ پریس، ۱۹۶۲ء

۶۴ - غلام سرور لاہوری : تاریخ مخزن پنجاب
لکھنو، نولکشور، ۱۸۷۷ء

۶۵ - " " " : گنج تاریخ،
لکھنو، نولکشور، ۱۸۷۷ء

۶۶ - فتح محمد جالندھری، مولوی : رپورٹ انجمن قصور۔
بابت ۱۸۷۹ء

۶۷ - فقیر محمد جہلمی، مولوی : حدائق الحنفیہ
لکھنو، نولکشور، ۱۹۰۶ء

۶۸ - " " " : زبدۃ الاقاویل فی ترجیح القرآن علی الاناجیل
جہلم (پنجاب) سراج المطالع، ۱۳۰۷ ہجری

۶۹ - فوق، محمد الدین : اخبار نویسوں کے حالات۔
لاہور، رفاہ عام، ۱۹۱۲ء

۷۰ - فیروز الدین ڈسکوی، مولوی : دفع طعن نکاح زینب
لاہور، مفید عام گزٹ۔

۷۱ - کنہیا لعل ھندی : تاریخ لاہور
لاہور، وکٹوریہ پریس، ۱۸۸۴ء

۷۲ - گارساں دتاسی، موسیو : مقالات گارساں دتاسی
دہلی (ھند) انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۳ء

۷۳ - گوھر نوشاہی : مطالعہ اقبال
لاہور، بزم اقبال ۱۹۷۱ء

۷۴ - لیپل گرفن، سر : رولرز آف انڈیا - اردو ترجمہ از نظیر حسین
حیدر آباد (ھند) جامعہ عثمانیہ

۷۵ - " " " : تذکرہ روسائے پنجاب ترجمہ از نوازش علی سید۔
لاہور، نولکشور، ۱۹۱۱ء

۷۶ - محمد اسلم، بیگ : تاریخ گجرات
۱۸۷۰ء

۷۷ - محمد الدین : روضۃ الادبا
لاہور، انجمن پنجاب ۱۸۷۸ء

۷۸ - محمد برکت علی خاں بہادر : رپورٹ انجمن اسلامیہ پنجاب لاہور۔
لاہور، رفیق ھند پریس، ۱۸۸۶ء

۷۹ - محمد حسین آزاد، مولانا : مقالات آزاد، مرتبہ آغا محمد باقر۔
لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۶۸ء

۸۰ - " " " : خمکدہ آزاد مرتبہ آغا محمد طاہر بنیرہ آزاد
دہلی، محبوب المطابع، ۱۹۳۰ء

۸۱ - محمد حسین آزاد، مولانا : نظم آزاد
لاہور، شیخ مبارک علی، ۱۹۴۷ء

۸۲ - " " " : مکاتیب آزاد مرتبہ مرتضیٰ حسین فاضل
لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء

۸۳ - محمد عتیق صدیقی : صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و رسائل
علی گڑھ (بھارت) انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۲ء

۸۴ - محمود شیرانی، حافظ : پنجاب میں اردو، مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی۔
لاہور، کتاب نما، ۱۹۶۳ء

۸۵ - نامی، غلام دستگیر : تاریخ جلیلہ۔
لاہور، گلزار عالم پریس، ۱۹۶۰ء

۸۶ - نسیم رضوی، ملک محمد باقر : شعرائے پنجاب۔
گجرات (پاکستان) گجرات پرنٹنگ پریس ۱۹۳۷ء

۸۷ - نور احمد چشتی، مولوی : تحفہ چشتی
لاہور، مطبع پنجابی، ۱۲۳۷ھ

۸۸ - " " " : تحقیقات چشتی، مرتبہ احسان علی
لاہور، پنجابی اکیڈمی، ۱۹۶۴ء

۸۹ - " " " " : عجائبات چشتی (طبع اول)
لاہور، ۱۹۶۰ء

۹۰ - " " " " : یادگار چشتی، مرتبہ گوہر نوشاہی
لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء

۹۱ - نور اللہ، سید : تاریخ تعلیم ھند۔
نئی دہلی (انڈیا) نیشنل ٹرسٹ ۱۹۷۳ء

۹۲ - وحید الدین، فقیر سید : روز گار فقیر
لاہور، سید برادرز ۱۹۵۰ء

۹۳ - وحید قریشی، ڈاکٹر : مطالعہ حالی
لاہور، استقلال پریس ۱۹۶۱ء

۹۴ - وکیلی فوفلزائی : درۃ الزمان
کابل (افغانستان)

۹۵ - ولی اللہ، حافظ : مباحث دینی
لاہور، مطبع مصطفائی، ۱۸۷۱ء

مقالات و مقدمات

۹۶ - اشفاق انور (مترجم) رپورٹ انجمن پنجاب
لاہور، سہ ماہی صحیفہ، جولائی ۱۹۶۷ء

۹۷ - سرداری لال ، ۱۸۵۷ کا غدر اور پنجاب
پنجاب یونیورسٹی۔

۹۸ - ستیارام کوہلی : مقدمہ ظفرنامہ رنجیت سنگھ از الرناتھ اکبری
لاہور، ۱۹۲۸ء

۹۹ - عبدالقادر، سر : اردو ادب انیسویں صدی میں ترجمہ (صفیہ نقوی)
(مقالہ) لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۵۳ء

۱۰۰ - گراہم بیلی : ہسٹری آف اردو لٹریچر ترجمہ از حمیدہ ملک
لاہور، پنجاب یونیورسٹی۔

۱۰۱۔ گوہر نوشاہی : اردو شاعری میں لاہور کا حصہ۔ (مقالہ)
پنجاب یونیورسٹی۔

۱۰۲۔ " " : مقدمہ یادگار چشتی۔
لاہور، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۵ء

۱۰۳۔ محرم علی چشتی، مولوی : اردو کی زباندانی۔
لاہور، ہفتہ وار رفیق ہند، ۱۵ مارچ ۱۸۸۴ء

۱۰۴۔ محمد باقر، آغا نبیرہ آزاد : مرحوم انجمن پنجاب۔
لاہور، اورنٹیل کالج میگزین، فروری تا مئی ۱۹۴۴ء

۱۰۵۔ " " " : پیش لفظ مقالات مولانا محمد حسین آزاد (جلد اول)
لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۴۴ء

۱۰۶۔ محمد شجاع الدین، پروفیسر : لاہور کی سیاسی، تہذیبی اور تمدنی تاریخ۔
لاہور، نقوش، لاہور نمبر

۱۰۷۔ محمد عبداللطیف، ڈاکٹر : مقدمہ دیوان منور
لاہور، پیکجز، ۱۹۷۳ء

۱۰۸۔ محمد عبداللہ قریشی : حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں
لاہور سہ ماہی اقبال ۱۹۵۴ء

۱۰۹۔ ممتاز گوہر : عجائبات چشتی اور اسکا مصنف
کراچی، قومی زبان، مارچ ۱۹۷۸ء

۱۱۰۔ نور احمد چشتی : مقدمہ عجائبات چشتی
لاہور، ۱۸۶۰ء

انگریزی مطبوعات

111. BUCKLAND
- Dictionary of Bcography,
  Lahore, Al-Beruni Press

112. CUNNINGHAM
- History of Sikhs
  Calcutta, W.Roy 1904

113. ELSMI-G.R.
- Thirty years in the Punjab
  Lahore, Al.Baruni Press, 1975

114. EVANSBELL.
- Anexation of the Punjab
  Lahore, Al-Baruni Press, 1975

115. GUPTA, A.N.
- History of the Sikhs
  Lahore - 1944

116. IBBETSON
- Punjab Castes,
  Lahore, 1883-1914

117. JAMES, BURGESS
- Chronology of Modern India, 1494 to 1894
  Lahore, Al-Beruni Press, 1975

118. LEPAL H. GRIFFIN, SIR
- Chief and Families of note in the Punjab
  Lahore, Punjab Government 1909 - 1911

119. MOHAMMAD BAQIR DR.
- Lahore, Past and Present
  Lahore Punjab University Press, 1952

120. MOHAMMAD LATIF SYED
- History of the Punjab
  New, Dehli, Eurasia Publishing House, 1964

121. MOHAMMAD LATIF SYED
- Lahore
  Lahore Minhaj-ud-Din, 1957

122. MOHAMMAD SADIQ
- Twentieth Century Under literature
  Breda, Pudma, 1947

123. STEINBACK, HENRY
- Punjab History,
London, Smith, 1896

124. WAHEED-UD-DIN FAQIR.
- The Real Ranjit Singh,
Karachi, Lion Press, 1965

125. WALKER, G.C.
- Lahore Distrit Gazete
Lahore, Government Printing Press, 1893-94.

اخبارات و رسائل

۱۲۶ - اقبال ، سہ ماہی ، لاہور ، ۱۹۵۴ء

۱۲۷ - اورینٹل کالج میگزین ، لاہور ، فروری تا مئی ۱۹۴۴ء

۱۲۸ - رفیق ہند ، ہفتہ وار ، لاہور ، جنوری ۱۸۸۴ء تا ۱۹۰۳ء

۱۲۹ - صحیفہ ، سہ ماہی ، لاہور ، جولائی ۱۹۶۷ء

۱۳۰ - کوہ نور ، ہفتہ وار ، لاہور ، ۱۸۵۰ ، ۱۸۵۹ ، ۱۸۷۷ء

۱۳۱ - نقوش ، لاہور نمبر ، لاہور -

۱۳۲ - " شخصیات نمبر ، لاہور -

متفرقات

۱۳۳ - رپورٹ انجمن اسلامیہ پنجاب لاہور۔

لاہور رفیق ہند ۱۸۸۶ء

۱۳۴ - مولوی فتح محمد

رپورٹ انجمن قصور (مطبع نامعلوم)

۱۳۵ - ابوالخیر عبداللہ (مرتب)

فہرست مخطوطات (خطی)

لاہور پنجاب یونیورسٹی۔

۱۳۶ - سید احمد دہلوی ، فرہنگ آصفیہ

لاہور مرکزی اردو بورڈ۔

۱۳۷ - نور الحسن نور اللغات

لکھنو، منیر پریس ۱۹۲۴

۱۳۸ - فہرست مخطوطات شیرانی (خطی)

لاہور، پنجاب یونیورسٹی۔

۱۳۹ - 〃 〃 آذر (خطی)

لاہور، پنجاب یونیورسٹی

140. S.M. ABDULLAH
- Descriptive Catalogue of the Persian, Urdu and Arabic - Manuscript
Manuscripts. Vol. I
Lahore, University of the Punjab, Lahore. 1942.